بارھواں خطبہ

اسلامی شریعت کا مستقبل
اور ملت اسلامیہ کا تہذیبی ہدف

آپ کو یاد ہوگا کہ ان گفتگوؤں کے شروع میں یہ بات عرض کی گئی تھی کہ اسلامی شریعت نہ تو محض کوئی نظام قانون ہے، نہ محض مذہبی مراسم کا کوئی مجموعہ، جیسا کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں۔ بلکہ یہ ان سب چیزوں پر محیط ایک ایسی جامع اور بھرپور ہدایت ہے جس کو ایک نیا مثالیہ paradigm قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک ایسا تہذیبی پیراڈائم ہے جس نے ایک تہذیب، ایک ثقافت اور زندگی کے ایک نئے ڈھنگ کو جنم دیا اور آئندہ بھی مستقبل قریب یا بعید میں، جیسا کہ اللہ کے علم میں ہے، اسلام کا یہ پیراڈائم جب سامنے آئے گا تو اس کا اظہار صرف قانون یا مذہبیات، صرف معاشرت یا سیاست ومعیشت کے میدانوں تک محدود نہیں ہوگا، بلکہ یہ ایک ہمہ گیر تہذیب کا احیاء ہوگا جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہوگی۔

تمدنیات کی تاریخ کا کوئی سنجیدہ اور انصاف پسند فاضل اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ اسلامی تہذیب جو ایک طویل عرصہ تک دنیا بھر میں تہذیب وانسانیت، اخلاق وروحانیت اور علم وحکمت کی مشعل بردار اور عدل وانصاف اور مساوات آدم کی علمبردار رہی ہے ایک جامع اور بھرپور تہذیب ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ تہذیبوں کی تاریخ کی جامع ترین تہذیب اسلامی تہذیب ہے۔ یہ اپنی جامعیت، اور اپنے تکامل اور توازن، تینوں اعتبارات سے دنیا کی تہذیبی اور تمدنی تاریخ میں ممتاز رہی ہے۔ اس کی جامعیت کا ایک مظہر زندگی کے وہ مختلف پہلو ہیں جن کو اسلامی تہذیب اور اسلامی تعلیمات نے متاثر کیا، جو اسلامی شریعت کی روشنی سے مستنیر ہوئے۔

تکامل سے مراد اسلامی تہذیب کا وہ طرۂ امتیاز ہے جو اس کے تمام پہلوؤں کو ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ بناتا ہے، جن میں کوئی ایک پہلو کسی دوسرے پہلو سے متعارض نہیں ہے، جن میں کوئی ایک پہلو کسی دوسرے پہلو کی قیمت پر اپنی تکمیل نہیں کرتا، بلکہ سب مل جل کر ایک ایسے گلدستے کی تشکیل کرتے ہیں جس میں ہر پھول کی ایک جگہ اور ایک مقام مقرر ہے۔ یوں یہ تہذیب ایک ایسا متوازن اور معتدل نقشہ پیش کرتی ہے جس میں انسانی زندگی کے تمام پہلو انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبار سے مکمل توازن کے غماز اور کامل اعتدال کے ترجمان ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی فکری روایت جس نے اس تہذیب کے مختلف پہلوؤں کو علمی مظہر بخشا اور تہذیبی لباس عطا کیا انسانی تاریخ کی موثر ترین فکری اور تعلیمی روایت رہی ہے۔ یہ فکر دین ودنیا کی جامع فکر تھی۔ اس فکر میں عقل ونقل کے مابین توازن موجود تھا۔ اس فکر میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی رہنمائی کا تمام ضروری سامان موجود تھا اور انسانی تاریخ کی جتنی اقوام، جتنی نسلیں، جتنی زبانیں بولنے والے، جتنے علاقوں سے تعلق رکھنے والے انسان پائے جاتے تھے اور وہ سب لوگ جو تاریخ کے مختلف ادوار میں اس تہذیب کے اثر میں آئے ان سب کو اس تہذیب نے اپنے اندر اس طرح سمویا کہ ان کی انفرادیت بھی برقرار رہی اور اس تاثیر کے نتیجہ میں ایسی اجتماعیت سامنے آئی جس نے ثقافتوں اور اقوام وممالک کی اس اتھاہ کثرت میں ایک بے مثال اور حسین وحدت پیدا کی۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی تہذیب اسلامی شریعت کے زیر اثر ایک فراخ دل اور accomodating تہذیب ہے، یہ ایک جذب کر لینے والی اور assimilative تہذیب ہے۔ یہ ان تمام تہذیبوں کے مثبت عناصر کو اپنے اندر سموتی رہی ہے جن سے اس کا احتکاک اور آمنا سامنا ہوا۔ ایران، یونان، ہندوستان، مصر وشام، اور یورپ کے مختلف علاقوں، مقامات اور تہذیبی ماحول میں جہاں جہاں اس تہذیب اور اس شریعت کے علمبرداروں کو کام کرنے کا موقع ملا وہاں کے تمام مثبت عناصر اس تہذیب میں آج بھی پائے جاتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ دوسری بہت سی اقوام کی طرح اس تہذیب نے مختلف خارجی عناصر اور اجنبی تہذیبوں سے استفادہ تو کیا ہو لیکن اس کا اعتراف نہ کیا ہو۔ بلکہ اسلامی تہذیب

نے ہر اس نکتے اور ہر اس نئی بات کا اعتراف کیا جو کسی دوسرے پس منظر سے اسلامی تہذیب میں آئی تھی۔ وہ علم طب جس میں ہزاروں لاکھوں مسلمان اطباء نے اپنے تحقیقی جوہر دکھائے، جن کے اثرات آج بھی مغرب میں نظر آتے ہیں اس کو مسلمانوں کی تاریخ میں ہمیشہ طب یونانی ہی کے نام سے یاد کیا گیا۔ اگر آپ میں سے کچھ حضرات کو جرمنی جانے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ جرمنی کے شہر ہائیڈل برگ میں جہاں علامہ اقبال مقیم رہے وہاں ایک طبی عجائب گھر ہے، جس میں علم طب کی ترقی اور جرمنی میں اس کے مختلف مدارج دکھائے گئے ہیں۔ اس میں آج بھی مسلمان اطباء کی کتابیں عربی اصل اور لاطینی ترجمہ کے ساتھ موجود ہیں۔ آج بھی وہاں دواسازی کے وہ آلات موجود ہیں جو برصغیر میں ہر حکیم کے مطب میں نظر آتے ہیں۔ وہاں جا کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم کسی روایتی مطب یا برصغیر کے کسی قدیم دواخانے میں آ گئے ہیں۔ ان سب کارناموں کے باوجود مسلمانوں نے علم طب کو ہمیشہ طب یونانی ہی کہا اور آج بھی وہ طب یونانی ہی کہلاتی ہے۔ اس لیے کہ اس طب کی ابجد مسلمانوں نے یونانیوں سے لی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ علم منطق جس میں ابن سینا، فارابی، امام غزالی، اور امام رازی جیسے حضرات نے اتنا اضافہ کیا اور ایسے ایسے نئے مباحث و افکار اس میں شامل کئے جو ارسطو اور اس کے تلامذہ کے حاشیہ خیال میں بھی نہ رہے ہوں گے۔ اس کو ہمیشہ یونانی منطق ہی کہا گیا۔ مسلمان مفکرین نے قدیم یونانی منطق کو ایک مختلف منطق کی شکل دے دی۔ اس میں نئے نئے انکشافات سے، نئے نئے رجحانات کے ذریعے بہت سے اضافے کیے، لیکن اسے ہمیشہ منطق یونانی ہی کے نام سے یاد کیا، اور یونانی منطق کے مؤسس و مدوّن اول حکیم ارسطاطالیس کو معلم اول اور مسلمانوں میں سب سے پہلے امام منطق اور امام عقلیات ابونصر فارابی کو معلم دوم قرار دیا۔ نہ تو کبھی ابونصر فارابی نے معلم اول بننے کی کوشش کی، اور نہ ہی کبھی کسی مسلمان ماہر منطق نے یہ اعتراف کرنے سے انکار کیا کہ یہ کارنامہ یونانیوں کا ہے۔ یہ بے تعصبی اور انصاف پسندی ایک ایسا امتیازی وصف ہے جو اسلامی تہذیب کو دوسروں سے ممیّز کرتا ہے۔

ایک اور عجیب پہلو اسلامی تہذیب میں یہ رہا ہے کہ اس تہذیب میں قرآن مجید ایک ایسا معیار اور ایک ایسی کسوٹی تھی جس نے ہر چیز کو پرکھ کہ یہ طے کیا کہ کیا چیز مسلمانوں کے لیے

قابل قبول ہے اور کیا چیز ناقابل قبول ہے۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ آج ہم کسی کی پرکھ سے اختلاف کریں، اور یہ طے کریں کہ فلاں شخص نے فلاں چیز کو پرکھ کر اس کے قابل قبول یا ناقابل قبول ہونے کا جو فیصلہ کیا تھا ہم اس سے آج اختلاف کرتے ہیں۔ یہ اختلاف رائے تو ہوسکتا ہے، اور ماضی میں بھی ہوتا رہا ہے، آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی مسلمان مفکر نے قرآن مجید کی تعلیم کو نظر انداز کرکے قرآن مجید کی تعلیم کے علی الرغم، کوئی نئی چیز اختیار کی ہو۔ اور اگر کسی نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو اس کو مسلم معاشرہ میں کوئی چلن حاصل نہیں ہوا۔ کوئی ایسی چیز مسلمانوں میں قبول عام حاصل نہیں کرسکی اور رواج نہیں پاسکی جس میں بنیادی حوالہ اور بنیادی معیار قرآن مجید نہ ہو۔ یہ رجحان اور یہ خواہش خالص فلاسفہ ومناطقہ، مثلاً فارابی، ابن سینا، ابن مسکویہ اور ابن باجہ جیسے اہل علم کے ہاں بھی نظر آتی ہے جو اصلاً اسلامی علوم اور قرآن و سنت یا فقہ وکلام کے متخصص نہیں تھے۔ حتیٰ کہ یہ رجحان ان غیر مسلم مفکرین کے ہاں بھی نظر آتا ہے جو مسلم ماحول میں بیٹھ کر کام کررہے تھے۔ اس کی ایک نمایاں مثال دور بنی عباس کے کے مفکر ہبۃ اللہ البغدادی کی ہے۔ پھر محض قرآن مجید ہی نہیں، بلکہ سنت کے ذخائر، فقہ اسلامی کے یہ سارے دفتر، جو شریعت کی قانونی تعبیر سے عبارت ہیں، جو شریعت کے قانونی پہلو کو منظم ومنضبط کرتے ہیں، اس میں ایسے احکام ہر دور میں سوچے گئے، ان پر عمل درآمد کیا گیا اور ان کو عام کیا گیا جن کا مقصد یہ تھا کہ دوسری اقوام سے اخذ وعطاء کے اصول وضوابط کیا ہونے چاہئیں۔ دوسری تہذیبوں میں کیا چیز مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہے اور کیا ناقابل قبول۔

مسلمانوں نے دوسروں سے مثبت اور تعمیری عناصر قبول کرنے میں نہ کبھی تأمل کیا اور نہ اس کو عار سمجھا۔ لیکن کسی سے جو کچھ لیا وہ چند اصول اور قواعد کی بنیاد پر ہی لیا۔ مسلمانوں نے کوئی چیز چاہے دوسروں سے لی ہو یا خود قرآن مجید اور سنت کے ذخائر سے اس کا بیج پھوٹا ہو، یا وہ مسلم تہذیب کی اپنی عطاء اور پیداوار ہو، ان سب کو مسلمان اہل علم نے تین درجات میں تقسیم کیا ہے۔ ان تینوں درجات کے لیے تین مختلف اصطلاحات، طویل عرصہ تک، کم وبیش ایک ہزار سال تک، اسلامی تاریخ میں مروج رہیں۔

۱۔ سب سے پہلا درجہ تو ان علوم ومعارف کا تھا جن کو علوم کے نام سے یاد کیا گیا۔ علوم سے

مراد علم و معرفت کے وہ ذخائر اور قواعد و ضوابط کے وہ مجموعے تھے جن میں بنیادی کردار انسانی عقل یا شریعت سے آنے والی ہدایت تھی۔ بالفاظ دیگر جو چیزیں خالص فکری نوعیت کی تھیں ان کو علوم کی اصطلاح سے یاد کیا گیا۔

۲۔ جو معاملات انسانی فکر اور تجربہ دونوں کا نتیجہ تھے، لیکن ان میں تجربے کو بنیادی اہمیت حاصل تھی ان کو فنون کے نام سے یاد کیا گیا۔

۳۔ جو چیزیں خالص تجربی نوعیت کی تھیں ان کو صنائع کے نام سے یاد کیا گیا۔

چنانچہ ابن خلدون، امام غزالی، تفتازانی، سید شریف جرجانی، حاجی خلیفہ، ابن الندیم جیسے بڑے بڑے حضرات جو مسلمانوں کی علمیات کی تاریخ میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان سب نے علوم، فنون اور صنائع کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اسلامی شریعت میں موجود توازن نے ہر علمی سرگرمی اور ہر فکری کاوش کو اس کے مقام پر رکھا اور الاھم فالاھم کے اسلامی اصول کو خالص فکریات و علمیات سے لے کر زندگی کے ہر گوشے میں برت کر دکھایا۔

اسلامی تہذیب کی جامعیت نے اس کے اندر ایک جاذبیت بھی پیدا کی۔ اسی جاذبیت کو بعض مغربی مصنفین نے Islamic eclecticism یا Islamic syncreticsm کے نام سے یاد کیا ہے۔ حالانکہ حقیقتاً یہ کوئی eclectic approach نہیں ہے جس میں کوئی شخص بغیر کسی عقلی سبب کے، بغیر کسی متکامل نظام اور ضوابط کی پابندی کے، مختلف چیزیں، مختلف اقوام اور مصادر سے جمع کر لے اور ان کا ایک غیر متناسب ملغوبہ تیار کر لے۔ شریعت اسلامی اس طرح کا غیر مرتب اور غیر منظم مجموعۂ احکام نہیں ہے۔ یہ مجموعہ کبھی بھی غیر متناسق، غیر منظم اور غیر مربوط اور منتشر اجزاء پر مشتمل مجموعہ نہیں رہا۔

احکام اور تعلیمات کے اس مجموعے میں اساس اور بنیاد کی حیثیت ہمیشہ قرآن پاک کو حاصل رہی ہے۔ قرآن پاک کی تعبیر و تشریح ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کی سنت اور صحابہ کرامؓ کے اجتماعی طرز عمل کے مطابق کی گئی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ قرآن مجید کی کوئی ایسی تعبیر مسلمانوں میں مقبول ہوئی ہو جس میں سنت رسول کو اساس کی حیثیت نہ دی گئی ہو، یا جس میں صحابہ کرامؓ کے اجتماعی فہم سے صرف نظر کیا گیا ہو۔ اگر صحابہ کرامؓ نے اجتماعی فہم کے ذریعے قرآن مجید کے

کسی حکم کا کوئی متعین مفہوم قرار دیا ہے تو تو امت میں ہمیشہ وہی مفہوم حتمی اور قطعی سمجھا گیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی اجتماعی فکر اور مسلمانوں کے اجتماعی فیصلے کے نتیجے میں جو تعبیرات سامنے آئیں، جن کو اجماع کی فقہی اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے، وہ مسلمانوں میں فیصلہ کن حیثیت کی حامل سمجھی گئیں۔

یہ چار بنیادی حدود وہ ہیں جن سے تجاوز کرنے کی کبھی کسی کو اجازت نہیں دی گئی۔ کوئی تہذیب کتنی ہی قیمتی چیز لے کر آئی ہو، کوئی قوم کتنا ہی مفید عنصر اپنے پاس رکھتی ہو، وہ انہی چار بنیادوں کی اساس پر قبول کیا گیا۔ اگر کوئی عنصر ان چار مصادر میں بیان کردہ حدود وشرائط کے مطابق تھا، مسلمانوں کے لیے، انسانیت کے لیے مفید تھا، اس کو امت مسلمہ نے قبول کر کے اپنے نظام میں جذب کیا اور اپنی شرائط پر جذب کیا۔ دوسروں کی شرائط پر کبھی کوئی چیز نہیں لی گئی۔ اس طرح ایک ہزار سال سے زائد پر محیط اس طویل عرصہ میں مختلف ومتضاد بلکہ متحارب عناصر سے مثبت اور تعمیری پہلوؤں کو چھانٹ چھانٹ کر الگ کیا گیا۔ آپ کے علم میں ہے کہ اسلام سے پہلے کی کئی سو سالہ تاریخ ایرانیوں اور رومیوں کے مابین طویل محاربہ کی داستانوں سے عبارت ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک عرصہ تک تاریخی کشمکش ہوتی رہی ہے جس کا قرآن پاک میں بھی ذکر موجود ہے۔ ایک اعتبار سے یہ دونوں دو متحارب کیمپ ہیں۔ لیکن ان دونوں متحارب کیمپوں سے بیک وقت مسلمانوں نے استفادہ کیا اور ان میں دستیاب علم وحکمت کی روشنی کو اپنے نظام میں اس طرح سمویا کہ وہ اسلام کے نظام کا حصہ بنی۔ چنانچہ پہلی صدی ہجری ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ اندلس، چین، ایران، ہندوستان، عراق اور بہت سے دوسرے عناصر کے تعمیری اور مثبت پہلوؤں نے نئی اسلامی تہذیب میں مناسب جگہ حاصل کی اور اس طرح اس گلدستے کی تشکیل میں وقتاً فوقتاً حصہ لیا جس کو اسلامی تہذیب، اسلامی شریعت کا تہذیبی مظہر یا قرآن پاک کی اصطلاح میں ملت کہا جاتا ہے۔

انجذاب اور اخذ واستفادہ کا یہ عمل مختلف دائروں کا پابند رہا ہے۔ سب سے بنیادی دائرہ جس کو اسلامی شریعت کا نقطہ پرکار کہا جا سکتا ہے، وہ عقائد اور عبادات کا دائرہ ہے۔ عقائد اور عبادات کے دائرے میں باہر سے آنے والی کوئی چیز کسی بھی قیمت پر قابل قبول نہیں ہے۔ باہر سے آنے والی ہر چیز کے لیے یہ دروازہ بند ہے۔ جو عقائد قرآن پاک نے بیان کیے ہیں وہ

عقائد مسلمانوں کے لیے کافی ہیں۔ یہ تو بیشک ہوا ہے (جیسا کہ گزشتہ ایک گفتگو میں بھی عرض کیا گیا) کہ کسی عقیدے کی formulation میں یا کسی عقیدہ کو articulate کرنے میں یا کسی عقیدہ کا دفاع کرنے میں وقت کے اسلوب استدلال سے فائدہ اٹھایا گیا ہو، اس طرح کا فائدہ ہر دور میں اٹھایا گیا، اور آئندہ بھی اٹھایا جائے گا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی غیر اسلامی عقیدہ کو اسلامی عقیدہ سمجھ لیا گیا ہو، یا کسی غیر اسلامی عقیدے کو کسی اور کی رضامندی کی خاطر گوارا کر لیا گیا ہو، یا نظر انداز کر لیا گیا ہو، یا عقیدہ کی اہمیت میں کمی کو برداشت کر لیا گیا ہو۔ عقیدہ کے باب میں امت مسلمہ کے دینی ضمیر اور مذہبی خمیر نے ہمیشہ احتیاط اور چوکسی کا رویہ اپنایا۔ یہاں تک کہ وہ معاملات جن کا تعلق عقائد سے نہیں تھا، جن کا تعلق محض مسلمانوں کی روزمرہ زندگی سے تھا، لیکن شریعت کے نظام میں ان کا ایک مقام تھا۔ مثلاً شریعت میں اگر کوئی چیز مستحب تھی، لیکن کوئی اور تہذیب اس مستحب عمل کو ناپسندیدہ سمجھتی تھی تو مسلمانوں کے عمومی مزاج نے کبھی اتنی مداہنت کو بھی قبول نہیں کیا کہ اس مستحب کو دوسروں کی خاطر نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ بات بھی کہ اسلام کے مستحبات کو دوسروں کی رضامندی کی خاطر غیر مستحبات قرار دیا جائے مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول تھی۔ جو اسلام کے مستحبات تھے وہ مستحبات رہیں گے، جو اسلام کے مندوبات تھے وہ اسلام کے مندوبات رہیں گے۔ کسی کی رضامندی کی خاطر مندوبات کو مکروہات میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کے لیے ذبیحۂ گاؤ ایک بہت حساس معاملہ رہا ہے۔ بہت سے بااثر ہندو گائے کو دیوتا مانتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے کہ مسلمان ہندوستان میں ۱۵ فیصد سے زیادہ کبھی نہیں رہے، انہوں نے ذبیحۂ گاؤ تک کے بارے میں جو محض ایک جائز فعل ہے کوئی مصالحت نہیں کی اور کسی مداہنت سے کام نہیں لیا۔ ایک تھوڑے عرصے کے لیے سلطنت مغلیہ کے ایک خاص دور میں حکومت نے یہ چاہا کہ مسلمان ذبیحۂ گاؤ کے متعلق نرمی کا رویہ اختیار کریں۔ اس زمانے کے بعض علماء نے بھی اس کو زیادہ قابل اعتراض نہ سمجھا۔ لیکن مسلمانوں کے دینی ضمیر نے اس کے خلاف شدت سے آواز اٹھائی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ذبیحہ گاؤ شریعت میں فرض یا واجب نہیں ہے اور نہ ہی گائے کا گوشت کھانا شریعت میں مستحب ہے۔ بلکہ محض جائز ہے۔ کوئی شخص گائے کا گوشت استعمال کرنا چاہے تو کر

سکتا ہے، جائز ہے۔ اس زمانے کی حکومت اور ارباب حل وعقد نے شاید اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا کہ ہندوؤں کی دلداری کی خاطر ذبیحہ گاؤ کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ حوصلہ شکنی کا اشارہ حکومت کی طرف سے ہوا۔ ہندوؤں کے اثرات سے بعض علاقوں میں ذبیحہ گاؤ پر پابندی لگ گئی۔

لیکن ہندوستان کے سب سے بڑے مذہبی عبقری نے اس پابندی یا حوصلہ شکنی کے خلاف آواز اٹھائی اور وزیراعظم ہند کو لکھا ذبح بقر در ہندوستان از اعظم شعائر اسلام است کہ ہندوستان میں گائے کا ذبیحہ اسلام کے بڑے بڑے شعائر میں سے ایک ہے اور آپ بادشاہ کو قائل کریں کہ وہ اس شعار اسلام کو نافذ کرے۔ چنانچہ بادشاہ وقت نے ایسا ہی کیا۔ اس نے اپنی یادداشت 'تزک جہانگیری' میں خود لکھا ہے کہ میں نے جب کانگڑے کا قلعہ فتح کیا تو اس کی خوشی میں اس شعار اسلام پر علی الاعلان عمل کیا اور قلعے کے دروازے پر میں اپنے ہاتھ سے گائے ذبح کی۔ اس کی کوئی اہمیت فقہ اسلامی میں نہیں ہے کہ گائے ذبح ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ لیکن حضرت مجدد الف ثانی جیسے بلند پایہ دینی قائد کے اس طرز عمل سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کا ان امور میں کیا مزاج رہا ہے، انہوں نے تھوڑا سا انحراف بھی اس ترتیب میں گوارا نہ کیا جو ترتیب شریعت میں پیش نظر تھی۔ ان شرائط کے ساتھ اور اس ذہنی وفکری ماحول میں مسلمانوں نے دوسروں سے کسب فیض کیا اور جو مثبت اور تعمیری عناصر دوسری اقوام میں موجود تھے انہیں صرف اپنی شرائط پر اپنے قواعد وضوابط کے مطابق اسلامی تہذیب کا حصہ بنایا۔

دوسرا دائرہ جو عبادات اور عقائد کے دائرے سے ذرا وسیع ہے وہ اخلاق اور معاملات کا دائرہ ہے۔ اخلاق اور معاملات میں مقامی رواجات ملے جلے ہوتے ہیں۔ ایسا مشکل سے ہی ہوتا ہے کہ کوئی ایسا اخلاقی رویہ یا طرز عمل یا تصور ایسا ہو جو مقامی رواج سے بالکل الگ یا لاتعلق ہو، چونکہ مقامی رواجات اور یہ چیزیں ملی جلی ہوتی ہیں۔ اس لیے اسلامی شریعت کا مزاج اس معاملے میں قدرے نرمی کا ہے۔ شریعت کا رجحان ان امور میں یہ رہا ہے کہ مکارم اخلاق اور رذائل اخلاق کی نشان دہی کر دی جائے، معاملات میں جو چیزیں ناپسندیدہ ہیں ان کی نشان دہی کر دی جائے، اور اس کے بعد کے معاملات میں مسلمانوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ شریعت

کی ان حدود کی پابندی کرتے ہوئے کہ کیا چیز مکارمِ اخلاق کی حیثیت رکھتی ہے؟ کیا چیز رذائل میں شامل ہونے والی ہے؟ اور معاملات کی حدود اور قواعد کیا ہیں؟ ان حدود کے اندر وہ جس قوم یا علاقے کا جو رواج اور جو طریقہ اختیار کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک مرتبہ عمل اور فیصلہ کی یہ آزادی دینے کے بعد عامۃ الناس کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہو کہ بس اب ہر شخص اپنے ذاتی مفاد یا نفسانی خواہشات و جذبات کی روشنی میں فیصلے کرتا پھرے۔ بلکہ اس فیصلے کو بھی چند عمومی اخلاقی قیود کا پابند بنایا گیا ہے۔ اہل علم کا یہ ایک اہم فریضہ اور ذمہ داری رہی ہے کہ وہ مسلسل اس پر نظر رکھیں کہ باہر سے کیا چیز آرہی ہے اور مسلمان باہر سے کیا چیز لے رہے ہیں۔ محاسبے کا ایک عمل مسلسل جاری رہا ہے اور بے شمار اہل علم نے اپنی زندگیاں اس پر صرف کی ہیں کہ اپنی اپنی اقوام اور اپنے اپنے علاقے کے رواجات پر ہمیشہ نظر ڈالتے رہیں اور جب بھی کوئی چیز ایسی نظر آئے جو اسلامی شریعت سے ہم آہنگ نہ ہو اور امت مسلمہ کے اجتماعی ضمیر اور قومی مزاج کے لحاظ سے ناقابل قبول ہو تو اس کی نشان دہی کی جائے۔ بعض حساس اہل علم اس معاملے میں زیادہ متشدد رہے ہیں۔ کچھ دوسرے حضرات کا رویہ اس معاملہ میں قدرے نرمی کا رہا ہے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مسلمان اہل علم نے بالاتفاق اس راستے کو کھلا چھوڑ دیا ہو اور آنے والے تمام عناصر کو ہمیشہ داخلے کی کھلی اور بے قید آزادی دے دی ہو۔

تیسرا دائرہ مقامی رسم و رواج اور علاقائی ثقافت کا دائرہ ہے۔ اس کے لیے فقہاء اسلام نے عادات کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ آج کل ثقافت کے مقامی یا علاقائی مظاہر کو بھی عادات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ عادات میں شریعت نے بہت آزادی دی ہے۔ کسی بھی قوم کی عادات اور ثقافت اور رواج کو شریعت نے مٹانے، یا تبدیل کرنے یا کمزور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جس قوم کی جو عادت، مزاج یا ثقافت ہے وہ برقرار رہنی چاہیے، لیکن اس پر اسلام کا رنگ یا شریعت کی چھاپ آجانی چاہیے۔ چنانچہ جو قومیں اسلام میں داخل ہوتی گئیں ان کے مقامی لباس، ان کے مقامی رواجات، کھانے پینے کے طور طریقے، ان کے مقامی اور علاقائی تہوار، خوشی منانے کے طریقے اور عادات کے بہت سارے پہلو جاری رہے۔ لیکن آہستہ آہستہ اسلام اور شریعت کی گہری چھاپ ان سب پر پڑتی گئی اور وہ اسلام کے نظام میں جذب ہوتے چلے گئے۔

آخری دائرہ وسائل اور ذرائع کا ہے۔ ہر وہ جائز وسیلہ اور ذریعہ جو کسی جائز اور پاکیزہ مقصد کے حصول میں ممد ومعاون ہو اس کو استعمال کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ پسندیدہ ہے۔ جتنا وہ مقصد پسندیدہ ہوگا جس کی خاطر جائز وسیلہ یا ذریعہ اختیار کیا جارہا ہے اتنا ہی پسندیدہ وہ وسیلہ بھی سمجھا جائے گا۔لہذا ہر جائز مقصد کے لیے ہر جائز وسیلہ کے حصول کی مسلمانوں کو کھلی آزادی ہے۔ اس معاملے میں شریعت کی طرف سے کوئی رکاوٹ یا پابندی نہیں ہے۔سوائے ان عمومی اعتبارات کے جو ہر معقول انسان کے پیش نظر ہوتے ہیں۔

یہ وہ فکری فریم ورک یا فقہی فریم ورک تھا جس میں اسلامی تہذیب کی اُٹھان ہوئی اور جس میں اسلامی تہذیب نے مختلف تہذیبوں سے کسب فیض کیا۔ اس مزاج کا لازمی تقاضہ جامعیت اور جامعیت کا لازمی تقاضہ جاذبیت وانجذاب تھا۔ یہ جامعیت اور جاذبیت جب ہی ہوسکتی ہے جب اس کا ارتکاز ایک مرکز پر ہو۔ جو چیز خود کسی مرکز پر مرتکز نہ ہو اس میں دوسروں کے لیے کوئی جاذبیت نہیں ہوسکتی۔ جاذبیت کے لیے نقطۂ ارتکاز کا وجود لازمی ہے۔ اسلامی تہذیب اور ملت مسلمہ کا عقیدہ توحید ہے۔توحید کے اس نقطۂ ارتکاز کی وجہ سے مسلمانوں میں علوم کی وحدت، تہذیبوں کی وحدت، انسانیت کی وحدت کے یہ سب تصورات پیدا ہوئے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی علوم کی تاریخ میں ایک طویل عرصے تک ایسے ہزاروں بلکہ شاید دسیوں ہزار ایسے اہل علم ملتے ہیں کہ جو علم وحکمت اور تہذیب ودانش کے کسی ایک پہلو میں ممتاز نہیں ہیں، بلکہ علوم وفنون کی متعدد شاخوں میں امامت اور قیادت کا مقام رکھتے ہیں۔ جہاں ایک شخص بیک وقت حکیم بھی ہے وہ فقیہہ بھی ہے، متکلم بھی ہے، شاعر اور ادیب بھی ہے۔ وہ ماہر نفسیات، ماہر ریاضیات اور ماہر فلکیات بھی ہے اور اس میں تصوف اور روحانیات کا ذوق بھی پایا جاتا ہے۔ فارابی، البیرونی اور ابن سینا جیسے خالص غیر مذہبی علوم کے متخصصین سے لے کر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تک اور بعد کے اہل علم تک یہ پہلو بڑا نمایاں ہے کہ ایک صاحب علم کے فکری کارنامے اور علمی ترکتازیاں کسی ایک میدان تک محدود نہیں ہیں۔ بلکہ اپنے میدان تخصص کے علاوہ بھی متعدد میدانوں میں ایک شخص کے کارنامے ہیں۔ بیسویں صدی میں دنیائے اسلام، بلکہ خود برصغیر میں بھی ایسے اہل علم موجود رہے ہیں جن کے کارنامے مختلف

میدانوں میں بڑے نمایاں ہیں۔

اس وحدت وارتکاز نے اسلامی تہذیب کو ایک ام الحضارات (تہذیبوں کی ماں) کا درجہ دیا۔ تہذیبوں کی ماں سے مراد یہ ہے کہ ماضی کی جتنی تہذیبیں تھیں سب کے مثبت عناصر اس تہذیب میں موجود ہیں۔ ماضی کی تہذیبیں اکثر وبیشتر مختلف آسمانی مذاہب کی بنیاد پر قائم ہوئیں۔ جس طرح قرآن مجید نے اپنے آپ کو مھیمن قرار دیا ہے۔ یعنی قرآن مجید تمام آسمانی کتابوں پر نگہبان ہے، ان کا محافظ ہے اوران کا خلاصہ اوران کی روح اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اسی طرح وہ تہذیب جو قرآن مجید کے زیراثر قائم ہوئی وہ بھی مھیمن علی الحضارات ہے، اس نے نہ صرف مختلف تہذیبوں کے مثبت عناصر کو اپنے اندر جمع کیا بلکہ ماضی کی تہذیبوں کے تمام مثبت اور تعمیری عناصر کو اسلامی تہذیب نے اپنے اندر سمو کر محفوظ کر لیا، ان کی پرورش کی، ان کو ترقی دی، اور بالآخران میں سے بہت سے عناصر کو جدید تہذیب کی طرف منتقل کیا۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اسلامی تہذیب کے ذریعے قدیم تہذیبوں کو جدید تہذیب تک پہنچادینے کی عظیم خدمت کا ابھی تک صحیح طور پر اعتراف نہیں کیا گیا۔ اور وہ وقت آئے گا کہ اسلامی تہذیب کے اس کارنامے کا اعتراف کیا جائے گا کہ اس نے ماضی کے سارے علمی وفکری ورثے کو اس طرح سے مرتب اور منظم انداز میں محفوظ رکھا کہ اس کی بنیاد پر مغرب میں تہذیب کی اُٹھان بہت آسان ہوئی۔

بعض حضرات اسلامی تہذیب اور جدید مغربی تہذیب میں جب مشترک عناصر کی نشان دہی کرتے ہیں تو وہ اسلامی تہذیب کی معنویت کے بارے میں کمزوری اور بے یقینی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مشترک عناصر تو ہر دو تہذیبوں میں پائے جاتے ہیں۔ کوئی بھی دو تہذیبیں شاید ایسی نہ ہوں جن میں کچھ نہ کچھ عناصر مشترک نہ ہوں۔ رہی وہ تہذیب جو اُم الحضارات کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کو جامع الحضارات کہا جاسکتا ہے اس میں ان تمام تہذیبوں کے وہ تمام مثبت عناصر لازماً پائے جائیں گے جن کو اس تہذیب نے آگے تک پہنچایا ہے۔

یہ تہذیب تمام آسمانی کتابوں کی جامع ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام جن سے تین بڑے مذاہب وابستگی کا اعلان واعتراف کرتے ہیں، ان کو اسلامی تہذیب اوراس کی علمبردار ملت اسلامیہ اپنا روحانی باپ تسلیم کرتی ہے۔ توحید پر ایمان کا دعویٰ دنیا کے تین بڑے مذاہب

کرتے ہیں۔ روحانی حقائق اور اخلاقی تصورات کے بارہ میں ان مذاہب میں کئی چیزیں مشترک ہیں۔اس لیے قرآن مجید نے جدید تہذیب کے ماننے والوں کو چودہ سو سال پہلے ایک دعوت دی تھی: تعاون اور ہمکاری کی دعوت: ''تعالوا الی کلمۃ سواء. .....'' یہ بات بہت اہم اور بڑی عجیب ہے کہ قرآن مجید میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ اے اہل چین آؤ ہمارے ساتھ ایک مشترکہ کلمہ پر جمع ہوجاؤ! حالانکہ چین کا نام عرب میں مانوس تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں چین کا ذکر ملتا ہے۔ ہندوستان میں ایک بڑی تہذیب قائم تھی، ہندوستان والوں سے یہ نہیں فرمایا گیا کہ آؤ! ہمارے ساتھ ایک مشترکہ کلمہ پر جمع ہوجاؤ۔ رسول اللہ ﷺ ہندوستان کے باشندوں سے ملے ہیں۔ آپ کے بعض ارشادات میں ہندوستان جاٹوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ معراج کی روایات میں حضور ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جاٹوں سے تشبیہ دی کہ جیسے جاٹوں کا بدن ہوتا ہے، طویل قامت اور پختہ جسم والے، اس طرح کا میں نے موسیٰ کو پایا۔ لیکن قرآن پاک میں ہندوستانیوں کو دعوت نہیں دی گئی۔ اسی طرح سے اور کئی اقوام سے قرآن کے اوّلین مخاطبین مانوس تھے، لیکن جب تعاون اور ہم کاری کی یہ دعوت دی گئی تو وہ اہل کتاب کو دی گئی۔ اس لیے کہ آئندہ کی عالمی تہذیب جس سے مسلمانوں کو واسطہ پیش آنا تھا وہ اہل کتاب کی قائم کردہ تہذیب تھی۔ اور اگر اسلام کو کوئی بین الاقوامی تہذیبی کردار ادا کرنا ہے تو اس عالمی تہذیب کے ساتھ اسلام کا واسطہ ناگزیر ہے جو اہل کتاب کے ہاتھوں قائم ہوئی۔

اسلام کی ام الحضارات تہذیب ایک اور پہلو سے بھی ام الحضارات کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسلام سے پہلے جتنی تہذیبیں تھیں وہ یا تو بہت محدود جغرافیائی اور علاقائی تہذیبیں تھیں، یا لسانی حیثیت رکھتی تھیں یا پھر خالص نسلی اور بالکل ہی مقامی تہذیبیں تھیں۔ اسلام سے پہلے عالمگیر تہذیبوں کی مثالیں برائے نام ہیں۔ رومن تہذیب کو ایک حد تک عالمگیر تہذیب کہا جاسکتا ہے، لیکن رومن تہذیب عالمگیر تہذیب کی حیثیت اس لیے اختیار نہیں کرسکی کہ سلطنت روما کا بیشتر دارومدار مغرب کے علاقوں کی ان اقوام پر تھا جو سب کی سب عیسائی تھیں۔ غیر مغربی اقوام سے ان کا تعلق ایک مستعمر آقا اور غلام کا تھا۔ جو تعلق ایک استعماری طاقت کا اپنے مفتوحہ علاقوں سے ہوتا ہے۔ اسی طرح کا تعلق سلطنت روما کا غیر رومی

علاقوں سے رہا ہے۔ سلطنت روما کا برابری کی سطح پر اخذ وعطاء کا تعلق غیر رومی علاقوں سے نہیں رہا۔ برابری کی سطح پر اخذ وعطاء کا یہ تعلق صرف اسلامی تہذیب کے ذریعے قائم ہوا۔ جس میں مفتوحین، مفتوحین نہیں تھے۔ فاتحین، فاتحین نہیں تھے۔ فاتحین نے مفتوحین کے سامنے دست سوال پھیلایا اور زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ مفتوحین نے فاتحین کا پیغام لے کر فاتحین سے زیادہ جوش وخروش کے ساتھ اس کی تشریح وتوضیح کی، اور بہت جلد ایک مرحلہ ایسا آیا کہ قیادت اور امامت کا مقام فاتحین کے بجائے مفتوحین کو حاصل ہوگیا۔ نہ صرف فکری اور خالص علمی معاملات میں، بلکہ بہت جلد اور بالآخر سیاسی اور عسکری میدان میں بھی جو ماضی کے مفتوحین تھے وہ فاتحین قرار پائے، قائدین قرار پائے اور ماضی کے ''فاتحین'' اور حال کے ''مفتوحین'' نے مل کر اس نئی تہذیب کی یکساں جوش وخروش سے خدمت کی۔

اس تہذیب کی اساس ظاہر پرستی پر نہیں تھی، حقیقت پرستی پر تھی۔ یہ بات بہت اہم ہے اور آگے چل کر دوسری تہذیبوں سے اسلام کے تعلقات کے باب میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اس تہذیب کے علم، قانون، نظام اجتماعی، عدل وانصاف، غرض مختلف پہلوؤں میں مادیات کے بجائے اخلاقیات پر زور تھا۔ اس تہذیب نے دنیا کی تاریخ میں پہلی بار لسانی، قبائلی، نسلی اور علاقائی تعصبات کا خاتمہ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ بلاشبہ بعض صورتوں میں ان تعصبات کا مکمل خاتمہ نہیں ہوسکا۔ علاقائی تعصبات مسلمانوں میں بھی سر اٹھاتے رہے۔ اور جہاں جہاں وہ ابھر کر سامنے آئے انہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔ لیکن دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ کامیابی کے ساتھ اگر کسی نے ان تعصبات کا خاتمہ کیا یا کم از کم ان کو بہت محدود کردیا تو وہ اسلامی تہذیب تھی جس نے سب کو ایک رنگ میں رنگ دیا، اور وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کے کامیاب نمونے اور مظاہر دنیا کے سامنے پیش کیے۔

ابھی میں نے وحدت علوم کی بات کی ہے۔ وحدت علوم کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب کا ایک اور طرۂ امتیاز علم ودانش کی مقصدیت بھی ہے۔ جب تک کسی علم کا مقصد اور غرض وغایت متعین نہ ہو، اسلام کی علمی روایت نے اس کو قبول نہیں کیا۔ کسی بھی علم یا علمی کاوش کو قبول کرنے سے پہلے اس کی غرض وغایت کا تعین کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے دور کی لکھی ہوئی ہر کتاب، خواہ وہ علم طب یا ہندسہ کی کتاب ہو، یا خالص الٰہیات اور عقلیات کی کتابیں ہوں،

ان میں سے ہر کتاب میں اس علم کا مقصد، غرض وغایت اور ہدف متعین کرنے کی ہمیشہ کوشش کی گئی۔ اسلام کی علمی روایت میں ایک اصطلاح تھی رؤس ثمانیة (آٹھ عنوانات)، جب کوئی طالب علم کوئی علم یا فن سیکھنے کے لیے جاتا تھا تو سب سے پہلے اسے اس علم یا فن کے رؤس ثمانیة سے واقف کرایا جاتا تھا۔ آٹھ عنوانات اس کے سامنے رکھے جاتے تھے۔ سب سے پہلے یہ کہ اس فن کی غرض وغایت کیا ہے؟ مثلاً اگر آپ گرامر پڑھنا چاہتے ہیں تو آخر اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ گرامر پڑھنے سے آپ کو اس دنیا میں یا اُس دنیا میں کیا فائدہ یا نفع ہوگا؟ گرامر یا قواعد کسے کہتے ہیں؟ اس کی تعریف کیا ہے؟ اس علم کی حقیقت کیا ہے؟ اس لیے ضروری تھا کہ پہلے دن سے آپ کے سامنے واضح ہو جائے کہ جو علم آپ سیکھنا چاہتے ہیں اس کی یہ تعریف ہے۔ پھر جو کتاب آپ پڑھ رہے ہیں اس کا مؤلف کون ہے؟ اس علم یا فن کی تاریخ میں مؤلف کا درجہ کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے وہ کس سطح کا انسان تھا۔ اس علم یا فن میں اس کا مقام کیا تھا؟ پھر علوم وفنون کی تقسیم میں یہ فن کہاں واقع ہے؟ اس علم کی اپنی اہمیت دنیائے علم و دانش میں کیا ہے؟ اس علم کے اہم مضامین کیا ہیں؟ کن کن مباحث سے اس علم میں بحث ہوتی ہے؟ اور سب سے آخر میں یہ بتایا جاتا تھا کہ اس علم یا فن کے حصول میں آپ کو کن کن مراحل سے گزرنا ہوگا۔

علوم وفنون کی تقسیم بھی مسلمانوں کا ایک دلچسپ موضوع رہی ہے۔ زمانہ قدیم، دوسری تیسری صدی ہجری سے لے کر بیسویں صدی کے لگ بھگ تک علوم کی تقسیم اور علوم کی تصنیف اور درجہ بندی، یعنی classification کا مضمون مسلمانوں میں ایک اہم مضمون رہا ہے۔ علوم کی درجہ بندی سے مراد یہ ہے کہ علم کی وحدت کو اگر ایک درخت تصور کیا جائے اور اس درخت میں قرآن پاک اور وحی الٰہی کی حیثیت ایک جڑ کی ہو تو پھر بقیہ علوم کی حیثیت کیا ہوگی؟ کس علم کی جگہ کہاں ہوگی؟ کس علم کی حیثیت تنے کی ہوگی؟ کس علم کی حیثیت شاخوں کی قرار پائے گی؟ کون سا علم بڑی شاخوں کی حیثیت رکھتا ہے؟ کونسا علم چھوٹی ٹہنیوں کی حیثیت رکھتا ہے؟ کس کی حیثیت برگ وبار ہے؟ کس کی حیثیت پھل کی ہے؟ کس کی حیثیت اس خشک پتے کی ہے جو آگے چل کر کھاد بنتا ہے؟ کس کی حیثیت اس رس کی ہے جو اس میں سے نکلتا ہے؟ اس طرح ہر فن کا ایک مقام اور جگہ متعین کی جائے، اس کی اہمیت بتائی جائے کہ اس علم وفن کی اہمیت کیا ہے۔

' پھر یہ بتایا جاتا تھا کہ اس فن کے اہم مضامین اور ابواب کیا ہیں؟ اور ان اہم مضامین اور ابواب کے پیچھے منطق کیا ہے، آج کے طالب علم کو ممکن ہے یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہو۔ لیکن مسلمانوں میں سات، آٹھ سو سال بلکہ ایک ہزار سال کے لگ بھگ یہ روایت رہی ہے کہ کسی علم یا فن کی کتاب میں جب مضامین بیان کئے جائیں تو یہ بھی بیان کیا جائے کہ فلاں بات پہلے یا بعد میں کیوں لکھی گئی ہے؟ اس باب کا پچھلے باب سے ربط کیا ہے؟ فقہ کی کتاب ہو یا حدیث و تفسیر کی، ربط کا پہلو ہر جگہ نظر آئے گا۔ غیر مربوط چیز مسلمانوں کے مزاج نے قبول نہیں کی۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ آج آپ کو اس ربط سے اتفاق نہ ہو اور آپ کہیں کہ میں ربط کے اس تصور سے اتفاق نہیں کرتا، بلکہ میری رائے میں ربط یہ ہے۔ لیکن یہ خیال کہ علم وفن کے مضامین میں باہم ربط ہونا چاہیے اور اس ربط کو دریافت کرنے کی کوشش کی جائے، یہ خود وحدت علوم اور مقصدیت علوم کا ایک بہت بڑا مظہر ہے۔

یہ تقسیم اس لیے بھی ضروری تھی اور یہ رؤس ثمانیة اس لیے بھی اہتمام سے بیان کیے جاتے تھے کہ شریعت نے علم نافع اور علم غیر نافع میں فرق کیا ہے اور یہ بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ بعض علمی کاوشیں ایسی ہوسکتی ہیں کہ جو علمی کاوشیں تو ہوں لیکن انسانوں کے لیے غیر نفع بخش ہوں، بلکہ ہوسکتا ہے کہ غیر نفع بخش سے بڑھ کر ضرر رساں ہوں۔ لہذا جو چیز انسانوں کے لیے ضرر رساں ہے اس کے حصول میں مسلمانوں کو وقت اور صلاحیتیں ضائع نہیں کرنی چاہئیں۔

اسلامی تہذیب کے اس پورے کیریر پر، اس کے پورے فکری لینڈ سکیپ پر نظر ڈالی جائے تو ان سب اجزاء میں آپس میں ایک گہرا ربط معلوم ہوتا ہے۔ یہ ربط اور تسلسل پیش نظر رہنا چاہیے۔ بعض اوقات یہ ربط اور تسلسل پیش نظر نہیں رہتا تو الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ الجھنیں پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں میں بہت سی کمزوریاں در آئی ہیں۔ ان کمزوریوں کی نشان دہی کرنا بھی اہل علم کی ذمہ داری ہے۔ جب، جہاں اور جس وقت کمزوری ظاہر ہونے لگے وہاں اہل علم کی یہ دینی، اخلاقی اور تہذیبی ذمہ داری ہے کہ اس کمزوری کی نشان دہی کریں اور بتائیں کہ یہ کمزوری فلاں وقت، فلاں جگہ، فلاں علاقے میں، فلاں اسباب کے ذریعے رونما ہوئی ہے۔ لیکن کمزوریوں کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ جو تسلسل امت

مسلمہ کے فکر اور تہذیبی رویے میں پایا جاتا ہے اس سے نہ صرف نظریں اوجھل نہیں ہونی چاہئیں بلکہ ہر قیمت پر اس کا تحفظ کیا جانا چاہیے۔

اگر ہم یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کا مکی دور اسلامی تہذیب کا ایک بیج تھا۔ وہ بیج مکہ مکرمہ میں زمین میں ڈالا گیا۔ مدینہ منورہ میں اسلامی تہذیب کا پودا پروان چڑھا۔ جب پودا اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب یہ پودا برقرار رہے گا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو اپنے خلفاء کے سپرد فرما دیا۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں یہ بار آور درخت بنا۔ اس بار آور درخت کے بیجوں اور برگ و بار سے بعد کے حضرات نے ابتدائی چار صدیوں میں روئے زمین کے ایک بڑے حصہ کو ایک باغیچے اور گلستان میں تبدیل کر دیا۔ پھر وہ جہاں جہاں گئے اس درخت کا بیج ساتھ لے کر گئے، جہاں اس بیج سے برگ و بار لانے والے بہت سے درخت پیدا ہوئے اور پوری دنیائے اسلام ایک بار آور باغ اور سرسبز گلستان میں تبدیل ہو گئی۔ مزید چھ سو سال یعنی اسلامی تاریخ کے ابتدائی ایک ہزار سال تک دنیا کو اس گلستان نے فیض یاب کیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی کوتاہیوں کی وجہ سے یہ درخت مرجھانے اور کمزور ہونے شروع ہو گئے۔ اس میں برگ و بار آنے بند ہو گئے اور ایک مرحلہ وہ آیا جب اس باغ پر دشمنوں نے قبضہ کر کے اصل درختوں کو کاٹ کر یا اُکھاڑ کر ان کی جگہ بے ثمر، نشہ آور اور اجنبی درخت لگانے شروع کر دیے۔ اس کے بعد جب اجنبی، بے ثمر اور نشہ آور تھوہر کے درخت گلستان میں اچھی طرح جاگزیں ہو گئے تو اجنبی دشمن نے مقامی باغباں تیار کیے اور یہ درخت اور باغیچہ ان کے حوالے کر کے چلا گیا۔ اب باغیچہ تو بظاہر آپ کے اپنے تصرّف اور قبضہ میں ہے۔ لیکن درخت وہی لگے ہوئے ہیں جو دشمن نے لگائے تھے، جو بے ثمر ہیں، بے نتیجہ ہیں، نشہ آور ہیں، کانٹے دار ہیں، زہریلے ہیں، وہی پودے ہر جگہ لگے ہوئے ہیں۔ ان پودوں نے زمین کے مزاج کو بدل دیا۔ جو پودا آپ دوبارہ لگانا چاہتے ہیں اس کا بیج نہیں ملتا۔ بیج ملتا ہے تو زمین اس پودے کو قبول نہیں کرتی۔ زمین قبول کرتی ہے تو باغبان اس کو رہنے نہیں دیتا۔ کہیں باغبان رہنے دیتا ہے تو دوسرے لوگ جوان نئے اور اجنبی پودوں سے مانوس ہو گئے ہیں اور ان سے پیدا ہونے والے نشہ کے عادی ہو گئے ہیں وہ اس تبدیلی یا اصلاح کے عمل سے اتفاق نہیں کرتے۔ یہ کشمکش موجودہ دور کے آغاز سے چلی آ رہی ہے۔

یہ بات کہ عہد نبویؐ کے عمل کو ایک پودے یا درخت یا بیج سے تشبیہ دی جائے محض شاعرانہ یا خطیبانہ اظہار بیان نہیں ہے، بلکہ واقعتاً قرآن پاک کی حیثیت ایک ایسے بیج کی ہے جس سے ہزارہا درخت نکلتے ہیں اور ان درختوں نے دنیا کو اپنے برگ و بار اور ثمر سے فیض یاب کیا ہے۔ یوں تو اس کی ہزاروں مثالیں دی جاسکتی ہیں، لیکن ایک چھوٹی سی مثال اسلام کے قانون وراثت کی ہے۔ یہ قانون وراثت قرآن پاک کی صرف تین آیتوں پر مبنی ہے۔ چھ ہزار چھ سو میں سے صرف تین آیتیں ہیں جن پر قانون وراثت مبنی ہے۔

انجینئر بشیر بگوی صاحب یہاں تشریف فرما ہیں۔ انہوں نے اسلام کے قانون وراثت کی تین کروڑ صورتیں فرض کی ہیں۔ ان کے کمپیوٹر پروگرام کی مدد سے ان تین آیات کی روشنی میں ان تین کروڑ صورتوں کے جوابات تلاش کیے جاسکتے ہیں جو کمپیوٹرائزڈ ہیں اور کمپیوٹر کی فنگر ٹپ سے آپ کو مل سکتے ہیں۔ اب یہ بات کہ تین آیت سے اتنی صورتیں فرض کر کے کمپیوٹرائز کردی گئی ہوں، یہ ہمارے سامنے ہے۔ اس کا اعتراف بڑے بڑے مغربی ماہرین نے بھی کیا ہے۔ لندن یونیورسٹی کے پروفیسر این جے کولسن (جنہوں نے اسلامی قانون پر کئی کتابیں لکھی ہیں) کا جملہ اس حوالے سے بڑا اہم ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

> "judicially, the law of succession is a solid technical achievemnt and Muslim scholars take a justifiable pride in mathematical precision with which rights of various heirs in any given situation can be calculated."

اسلامی تہذیب نے اپنی عطائیں ہر دور میں جاری رکھی ہیں۔ اسلامی تہذیب کی عطائیں مسلسل اور بے شمار ہیں۔ مغرب کی عطائیں محدود ہیں اور تسلسل کے ساتھ بھی جاری نہیں رہیں۔ نہ صرف اسلامی تہذیب بلکہ مشرق نے مغرب کو جو کچھ دیا ہے وہ مسلسل دیا ہے۔ مشرق کی عطا تواتر کے ساتھ جاری ہے اور انتہائی تعمیری اور بامقصد ہے۔ مغرب نے مشرق کو جو کچھ دیا ہے اس میں منفی اور مثبت دونوں عناصر شامل ہیں۔ مغرب نے کیا دیا؟ یونانی فلسفہ اور

جدید تہذیب۔ اس کے مقابلے میں مشرق کی بیشتر عطائیں مثبت بھی ہیں، تعمیری بھی اور دیرپا بھی۔ مغرب کی دی ہوئی بہت سی چیزیں منفی اور تخریبی ہونے کے ساتھ ساتھ وقتی اور عارضی بھی ہیں۔

یہاں ہمیں ایک اور سوال پیش آتا ہے جس کے جواب پر امت مسلمہ کے تہذیبی مستقبل کا بڑی حد تک دارومدار ہے۔ یہ بات تو قرآن پاک سے واضح ہے کہ مسلمانوں کا عالمگیر کردار یعنی امت مسلمہ کا بین الاقوامی کردار ایک یونیورسل رول اور ایک عالمگیر ذمہ داری کا حامل ہے۔ اس عالمگیر ذمہ داری کی انجام دہی میں مسلمانوں کو ہمیشہ جس قوت سے سابقہ پڑا ہے وہ یہود و نصاری کی قوت ہے۔ نزول قرآن کے وقت جزیرۂ عرب میں بالعموم اور حجاز میں بالخصوص عیسائی نہ ہونے کے برابر تھے۔ یہودی بہت تھوڑے تھے۔ بہت جلد مسلمانوں نے ان سے معاملہ کر لیا تھا اور مسلمان ان سے عہدہ برآ ہونے میں کامیاب رہے۔ عیسائی تعداد میں اتنے معمولی یا بے اثر تھے کہ ان کی کوئی قابل ذکر سیاسی حیثیت نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود قرآن پاک نے جتنی تکرار، کثرت اور تواتر کے ساتھ یہود و نصاری کا تذکرہ کیا ہے، خاص طور پر قرآن پاک کی پہلی دو سورتوں سورہ البقرہ اور سورہ آل عمران میں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن مجید مسلمانوں کو یہود و نصاری کی طرف سے آنے والی مزاحمت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تیار کر رہا ہے۔ چونکہ آئندہ طویل عرصہ اُمت مسلمہ کو یہ سابقہ پیش آنا تھا، کم از کم چودہ سو سال کی تاریخ تو اس کی شاہد ہے اور آئندہ مستقبل قریب یا بعید میں کب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا، اس کی انتہاء کب اور کیسے ہوگی؟ اللہ تعالی ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن اتنی بات اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ امت مسلمہ جب بھی اپنے بین الاقوامی کردار کی انجام دہی کے لیے اٹھی ہے اس کو یہودیوں یا عیسائیوں یا دونوں کی متفقہ قوت اور متحدہ محاذ سے واسطہ پڑا ہے۔ مستقبل میں اسلام اور مغرب کے تعلق کی ممکنہ نوعیتیں کیا ہیں؟ یا مغرب سے اخذ وعطاء کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے؟ اس کے بارے میں مسلمانوں کا ذہن صاف ہونا چاہیے۔

میں ابھی اس سوال پر دوبارہ آتا ہوں۔ مغرب سے معاملہ کرنا ہو، یا دوسری تہذیبوں سے، یا مغرب سے اسلام کے اخذ و عطاء کا مسئلہ ہو، اس میں بنیادی سوال جو مغرب میں پیدا ہوتا ہے اور اب بہت سے مسلمان بھی اس سوال کے بارے میں الجھاؤ کا شکار ہیں، وہ

عقل اور وحی کے تطابق اور توافق کا معاملہ ہے۔ اہل مغرب نے آج سے طویل عرصہ قبل (تقریباً دو ہزار سال پہلے) یہ طے کرلیا تھا کہ عقل اور وحی میں کوئی توافق نہیں ہے اور ان دونوں کا دائرہ کار الگ الگ ہے۔ انہوں نے ایک جملہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے منسوب کیا، معلوم نہیں وہ واقعتاً ان کا جملہ تھا یا نہیں، اگر انہوں نے ارشاد فرمایا ہوگا تو یقیناً کسی اور مفہوم میں ہوگا۔ بظاہر تو ان کا ارشاد معلوم نہیں ہوتا کہ ''جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دے دو، جو اللہ کا ہے وہ اللہ کو دے دو''۔ اس کی بنیاد پر مسیحی دنیا نے مذہب اور ریاست دونوں کا دائرہ کار الگ طے کر دیا۔

آج اہل مغرب دنیا میں جس سے بھی معاملہ طے کرنا چاہتے ہیں وہ دین و دنیا کی اسی تفریق کی بنیاد پر کرنا چاہتے ہیں کہ عقل اور وحی میں کوئی توافق نہیں ہے۔ ان کا اصرار اور مطالبہ، بلکہ شدید دباؤ ہے کہ ان دونوں میں تفریق کے اصول کو تسلیم کرو گے تو بات آگے بڑھے گی۔ جو قوم یا افراد اس تفریق کے قائل نہیں ہیں، ان سے مغرب کوئی آبرومندانہ معاملہ کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اسلام کے نظام میں عقل اور وحی ایک دوسرے کے حریف نہیں، بلکہ ایک دوسرے کے حلیف ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، یعنی انسانی علم یا سائنس اور مذہبی علم اور ہدایت یہ ایک دوسرے کے مؤید اور تکمیل کنندہ ہیں، ایک دوسری کی نفی کرنے والے نہیں ہیں۔ لہٰذا مادی اور مذہبی قوتیں، مادی اور روحانی قوتیں ایک دوسرے کی پشت پناہ ہیں۔ مادی قوت مذہب کی پشت پناہ ہے، جس کی مثالیں میں پہلے عرض کر چکا ہوں، اور مذہبی قوت مادیت کی پشت پناہ ہے۔ مسلمانوں کو جب بھی مادی قوت حاصل ہوئی ہے، خواہ وہ ریاست کی شکل میں ہو یا معاشی خوشحالی کی شکل میں یا دنیاوی علوم وفنون میں مہارت کی شکل میں، وہ ہمیشہ دین کی رہنمائی سے مستنیر ہوئی اور دین نے اس کو ہمیشہ ایک مثبت اور تعمیری جہت عطا کی، اور مسلمان جہاں بھی گئے، جہاں کہیں ان کو قابل ذکر تعداد حاصل ہوئی وہاں ریاست ان کے دین کی ممد ومعاون ثابت ہوئی۔ لہٰذا اسلام کی تہذیبی روایات میں مذہب وریاست دونوں جڑواں بھائی ہیں۔ ان دونوں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔

خود اسلام کے مزاج میں، شریعت کی اصل روح میں مذہب اور عقل ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔ عقل اور وحی دونوں شریعت کے مآخذ ہیں۔ اولین مآخذ یقیناً وحی الٰہی

ہے جو دو صورتوں میں ہم تک پہنچتی ہے۔ لیکن خود وحی الٰہی نے عقل کو شریعت کی تعبیر و تشریح میں ایک اہم ماٗخذ کی حیثیت عطا کی ہے۔ وحی الٰہی جو وحی خفی اور وحی جلی دونوں صورتوں میں ہم تک آئی ہے اس نے عقل انسانی کے اہم اور موثر کردار کو تسلیم کیا ہے۔ عقل انسانی کا فیصلہ اگر انفرادی ہو تو اس کے لیے قیاس، استحسان، مصلحت، ذریعہ وغیرہ کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔ لیکن اگر وہ فیصلہ اجتماعی ہو تو اس کے لیے اجماع، عرف اور شوریٰ اور اس طرح کی دوسری اصطلاح استعمال ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ اگر اجتماعی عقل نے کوئی ایسا فیصلہ بھی کر دیا ہے جو اسلام کی نظر میں آئیڈیل یا بہت مثالی فیصلہ نہیں تھا تو بھی اس فیصلے کو قبول کرنے کی گنجائش رکھی ہے۔ جس کے لیے اصطلاحات اور احکام موجود ہیں۔ عموم بلوی اسی طرح کا ایک حکم ہے۔ عموم بلوی کا مفہوم یہ ہے کہ اگر مسلمانوں میں کوئی ایسی چیز عام ہو جائے جو معیاری یا مثالی اسلامی زندگی میں نہیں ہونی چاہیے تھی، لیکن چونکہ عام ہو گئی اور مسلمانوں نے کسی ضرورت یا مجبوری کے تحت اسے قبول کر لیا ہے تو شریعت بھی بعض شرائط کے ساتھ بعض حالات میں اس کو برداشت کرنے اور گوارا کرنے کے لیے تیار ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب عقل اور نقل کا یہ مکمل توازن اور ہم آہنگی شریعت کے بنیادی مزاج کا حصہ ہے تو پھر جدید مادی آسائشیں اور جدید مادی کامیابیاں دینی اور اخلاقی اقدار سے ہم آہنگ کیسے کی جائیں؟ یہ بات متعدد مغربی مفکرین نے تسلیم کی ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو اخلاقی اور روحانی اقدار سے ہم آہنگ کرنے میں اگر کوئی قوم یا تہذیب تاریخ کے اس طویل عرصہ میں کامیاب ہوئی ہے تو وہ مسلمان ہیں۔ آج مسلمانوں کو جو بہت سے چیلنجز درپیش ہیں ان میں سے ایک چیلنج یہ بھی ہے کہ اخلاقیات اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے تقاضوں میں تعلق اور نسبت کیا ہے؟ اس کا تعین کیسے اور کن اصولوں کے تحت کیا جائے؟ اگر یہ کہیں کہیں متعارض ہیں تو وہ کون کون سے مسائل اور معاملات ہیں؟ اگر یہ باہم متوافق ہیں تو کہاں کہاں ہیں؟ باہم غیر جانبدار ہیں تو کہاں کہاں ہیں؟ اور ان تینوں صورتوں کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ اس رویہ کے تعین میں جو بنیادی حقیقت مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے، جو ماضی قریب میں بعض مفکرین اور اہل دانش کی نظروں سے کئی بار اوجھل ہوگئی، وہ شریعت کا دوام اور تسلسل ہے۔

مغرب نے اپنے خاص مزاج اور دوسرے مختلف اسباب کی بناء پر تغیر کو ایک مثبت اور قابل فخر نعرے کی شکل دے دی ہے۔ آج کے مغرب میں ہر نئی چیز قابل قبول ہے اور ہر قدیم چیز نا قابل قبول ہے۔ مغرب کا یہ مزاج پچھلے دو تین سو سال میں بنا دیا گیا ہے اور اس مزاج کو بنانے میں وہ تاجر، صنعتکار اور کارخانے دار بھی شامل ہیں جو اپنے خالص مادی مفاد کی خاطر ہر نئی چیز کے لیے مارکیٹ اور بازار پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ہر نئی چیز کے لیے بازار جب پیدا ہوگا جب ہر قدیم چیز کو ناپسندیدہ ٹھہرایا جائے گا۔ یہ سلسلہ گزشتہ دو، ڈھائی سو برس سے جاری ہے۔ اس مسلسل یک طرفہ مہم کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہر قدیم چیز ناپسندیدہ اور منفی بن گئی ہے اور ہر جدید چیز پسندیدہ اور مثبت سمجھی جانے لگی ہے۔ یہ مزاج اور رویہ مغربی تہذیب کے تاجرانہ مزاج نے پیدا کر دیا ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں کوئی چیز نہ محض اس لیے اچھی یا بری ہے کہ وہ قدیم ہے، اور نہ محض اس لیے اچھی یا بری ہے کہ وہ جدید ہے۔ نہ محض اس لیے پسندیدہ اور قابل قبول ہے کہ قدیم ہے، نہ اس لیے نا قابل قبول ہے کہ جدید ہے۔ کسی چیز کی قدامت اور جدت اسلام میں پسندیدگی کا معیار نہیں ہے۔ اس لیے کہ

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک دلیل
کم نظری قصہ جدید و قدیم

اسلام قصہ جدید وقدیم کو دلیل کم نظری سمجھتا ہے۔ جو چیز دراصل اسلام میں بقا اور تسلسل کی ضامن ہے اور جس بقا اور تسلسل کا مسلمانوں کو ساتھ دینا چاہیے وہ دائمی و ازلی دینی اقدار ہیں جو قرآن پاک و سنت ثابتہ میں بیان ہوئی ہیں، اور ان ازلی حقائق کے ساتھ ساتھ دین شریعت کی وہ متفقہ تعبیرات اور تشریحات بھی تسلسل کی ضامن ہیں جن پر مسلمانوں کا روز اول سے اتفاق رہا ہے۔ یہ جو متفقہ تعبیرات ہیں ان کی حیثیت اس پشتے کی ہے جس سے کسی دیوار کو سہارا دیا جاتا ہے۔ جب بنیاد بنائی جاتی ہے تو بنیاد کی حفاظت کے لیے بھی ایک پشتہ ہوتا ہے۔ یہ متفق علیہ تعبیرات اس پشتے کی حیثیت رکھتی ہیں جو اس بنیاد کی حفاظت کے لیے فراہم کیا گیا ہے۔ اس لیے اس بنیاد کے ساتھ ساتھ اس پشتہ کے بارے میں بھی کوئی مداہنت نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہ پشتہ کمزور ہوگا تو بنیاد بھی کمزور ہوگی۔

یہ بنیاد ہی دراصل وہ چیز ہے جس کو قرآن مجید میں کئی جگہ خیر اور ابقی کے لفظ سے یاد

کیا گیا ہے۔ اچھائیاں تو بہت ہوتی ہیں، لیکن بعض اچھائیاں عارضی ہوتی ہیں۔ بعض اچھائیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان سے بہتر اچھائیاں بھی موجود ہوتی ہیں۔ لہٰذا انسان کو ایک اچھائی سے بہتر اچھائی کے حصول کے لیے سرگرداں رہنے کی کہیں تو واقعی ضرورت ہوتی ہے اور کہیں محض شوق ہوتا ہے۔ آج ایک گاڑی حاصل ہوگئی ہے تو کل اس سے بہتر گاڑی حاصل ہو۔ آج ایک لباس ہے تو کل اس سے بہتر لباس ہو۔ یوں ہر اچھائی کے مقابلہ میں بہتر اچھائی کی تلاش انسان کرتا رہتا ہے، مادیات میں بھی اور اخلاقیات اور روحانیات میں بھی۔ اگر اچھائی عارضی ہے تو انسان اس کے بارے میں پرجوش نہیں ہوتا۔ کچا مکان ہو تو انسان پختہ مکان کو ترجیح دیتا ہے۔ کیونکہ وہ زیادہ دیرپا ہے۔ کمزور گاڑی کے مقابلے میں مضبوط گاڑی کو ترجیح دیتا ہے کہ وہ زیادہ دیرپا ہے۔ اس لیے خیر اور ابقی، یعنی جو چیز زیادہ باقی رہنے والی ہو اور بہترین ہو وہ انسان کے لیے ہمیشہ پسندیدگی کا مرکز رہی ہے۔

اس لیے یہ دینی حقائق جو قرآن پاک وسنت ثابتہ میں بیان کئے گئے ہیں، جن کو مسلمانوں کی متفقہ تعبیرات اور اجتماعی فہم کے پشتے نے مزید محفوظ ومضبوط بنایا ہے، ان کی حیثیت روحانی اور اخلاقی دنیا میں اس خیر اور ابقی کی ہے جس کے نمائندے بڑے بڑے انبیاء کرام علیہم السلام رہے ہیں اور اس دوام خیر اور تسلسل حق کو یقینی بنانے میں ان بنیادوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس خیر وابقی کی حفاظت کے بعد ہر تغیر وجدت قابل قبول ہے۔ اس بنیاد کے تحفظ کی ضمانت کے ساتھ ساتھ اس پشتے کے چاروں طرف جتنی جدتیں اور تغیرات انسان لاسکتا ہے اس کو اجازت ہے۔

بعض حضرات اپنی کم فہمی سے، کچھ حضرات اپنے سکہ رائج الوقت کو مزید چلن بخشنے کے لیے stability کے لیے stagnation کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ stability مطلوب چیز ہے، جبکہ stagnation غیر مطلوب ہے۔ اسلام کی روایت میں stagnation نہیں آسکتی اگر اسلام کا دیا ہوا اعتدال برقرار رہے، اگر بنیادی اقدار کی stability برقرار ہو۔ مسلم معاشرہ اپنے آئیڈیل اور مثالی تصور کے مطابق اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب اس میں تسلسل اور تغیر دونوں کی ضمانت دی گئی ہو، جب حقیقت اور عمل دونوں میں مکمل ہم آہنگی ہو۔ حقیقت ایک ہو اور عمل اس کے خلاف ہو تو پھر ہم آہنگی برقرار نہیں رہ

سکتی۔

اسلامی تہذیب کے اس تسلسل کو تحفظ دینے میں شریعت کے کلیات اور اساسات سب سے زیادہ بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ کلیات و اساسات اسلامی تہذیب کے تسلسل کے بھی ضامن ہیں اور اسلامی معاشرہ کی بقاء کو بھی یقینی بناتے ہیں۔ ان کلیات و اساسات میں شریعت کے پانچ بنیادی مقاصد بھی شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ کا ذکر میں پہلی گفتگو میں بھی کر چکا ہوں۔ یہ بنیادی مقاصد جو شریعت کے اساسات میں اہم حیثیت رکھتے ہیں یہ دراصل مسلم معاشرے، مسلم امت اور علی ہذا اسلامی تہذیب کے تسلسل کو یقینی بنانے کے لیے ہیں۔ سب سے پہلے دین کا تحفظ شریعت کا بنیادی مقصد ہے۔ لیکن جس چیز کو دین کا تحفظ کہتے ہیں خود اس کی اساس یا ہدف کیا ہے؟ مقصد تحفظ دین کا اپنا مقصد کیا ہے؟ بالفاظِ دیگر تحفظ دین کیوں؟ تحفظ دین دراصل معاشرے کی روحانی اساس، دینی ساخت اور اخلاقی تشکیل کے تحفظ کے لیے ناگزیر ہے۔ کیونکہ یہ تہذیب دراصل ایک امت کی اساس پر قائم ہے اور امت روحانی اور اخلاقی اساس پر قائم ہوئی ہے۔ اس کی بنیادی تشکیل (basic fabric) دراصل دینی، اخلاقی اور مذہبی ہے۔ اس لیے خود اس بنیاد کا تحفظ سب سے پہلا اور اولین مقصد ہونا چاہیے۔ اگر یہ پہلا مقصد نہ ہو تو پھر امت مسلمہ کی اساس متاثر ہو جائے گی، اساس کے کمزور ہونے سے معاشرہ انتشار اور اختلال کا شکار ہو جائے گا۔

اس کے بعد دوسری بڑی چیز خود اُمت کا، معاشرے کا جو جو اس تہذیب کا علمبردار ہے، طبعی وجود یا جسمانی بقاء یقینی ہونی چاہیے۔ جسمانی بقاء اور تسلسل کو یقینی بنانے کے لیے دوسرا مقصد تحفظ نفس ہے۔ اگر انسانوں کی جانیں محفوظ نہیں ہیں تو معاشرہ کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔ معاشرہ محفوظ نہیں رہ سکتا تو امت مسلمہ کی بقاء کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔ امت مسلمہ نہ ہو تو اسلامی تہذیب کا وجود برقرار نہیں رہ سکتا۔

پھر تیسرا مقصد تحفظ عقل ہے، جو معاشرے کی ترقی اور تہذیبی ارتقاء کی ضمانت ہے۔ ابھی آپ نے دیکھا کہ قرآن پاک وہ بیج ہے جس سے اسلام کے تہذیبی درخت کا تنا پھوٹتا ہے اور پھر اس تنے سے پھل نکلتے ہیں۔ یہ ساری فکری نوعیت کی سرگرمی ہے جسے اس درخت سے تشبیہ دی گئی۔ اس فکری سرگرمی کی قوت محرکہ انسان کی وہ فطرت سلیمہ اور وہ عقل سلیم ہے جو وحی

الٰہی کی روشنی سے مستنیر ہو۔ اس پورے عمل میں عقل سلیم کا کردار بنیادی ہے۔ عقل سلیم نہ ہو تو معاشرے کا جسمانی وجود تو ہوگا، لیکن فکری اور تہذیبی وجود ختم ہو جائے گا۔ اس لیے اسلامی تہذیب کے تحفظ اور تسلسل کے لیے شریعت نے تحفظ عقل کو بھی شریعت کے بنیادی مقاصد میں سے ایک قرار دیا ہے۔

پھر جسمانی اور فکری وجود محض فی الوقت اور زمانہ حال کے لیے کافی نہیں ہے، یہ وجود مستقبل میں بھی درکار ہے۔ مستقبل قریب میں بھی درکار ہے، مستقبل بعید میں بھی درکار ہے۔ اس کے لیے خاندان کا ادارہ ضروری ہے۔ تاکہ وجود کی ضمانت بھی ہو، اس میں تسلسل بھی ہو اور تسلسل کے ساتھ ساتھ یہ وجود اخلاق اور روحانیت کے تقاضوں کے مطابق ہو۔

آخری چیز تحفظ مال ہے، جو معاشرے کے مادی وسائل کے تحفظ کے لیے ہے۔ ہر تہذیب کو مادی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ روحانی اقدار اور اخلاقی اعتبارات کے ساتھ ساتھ مادی وسائل کی اپنی اہمیت ہے۔ جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ مادی وسائل کے بغیر کوئی تہذیب نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ اپنے کام کے تکمیلی مظاہر اور تعمیری کارنامے سامنے لا سکتی ہے۔ اس لیے مادی وسائل کا تحفظ بھی شریعت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔

یہ سارے کام بڑی حد تک اسی وقت ہو سکتے ہیں جب امت مسلمہ آزاد ہو، اسلامی تہذیب استقلال کی شان کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہو۔ فکر کے قافلے کی منزل درست ہو۔ آزاد، باوقار اور روحانی اصولوں کی علمبردار امت مسلمہ ہی اس عالمگیر تہذیب کی علمبردار بن سکتی ہے جو امت مسلمہ کا ہدف ہے۔ جب تک کوئی قوم ذہنی اور فکری طور پر آزاد رہتی ہے وہ جسمانی آزادی کو بھی یقینی بناتی ہے۔ لیکن اگر ذہنی اور فکری طور پر کوئی قوم آزاد نہ رہے تو پھر جسمانی آزادی اول تو حاصل نہیں ہوتی اور حاصل ہو بھی جائے تو جلد ہی بے معنی ہو جاتی ہے۔ آج مسلمانوں کی جسمانی آزادی جو کسی حد تک موجود ہے، وہ اس لیے بے معنی ہو کر رہ گئی ہے کہ ذہنی اور فکری آزادی امت مسلمہ کے بڑے حصے کو ابھی تک حاصل نہیں ہوئی۔

جب کوئی قوم ذہنی اور فکری طور پر غلام ہو جاتی ہے تو پھر اس کی پٹری کا کانٹا بدل جاتا ہے۔ اس کے علوم، اس کے فنون اور اس کے صنائع، یہ تینوں چیزیں غلط رخ پر چل پڑتی ہیں۔ برصغیر کی تاریخ اس کی واضح مثال ہے۔ برصغیر کی تاریخ میں پچھلے دو سو سال میں مذہبی

علوم کو پڑھنے پڑھانے والے بھی موجود رہے۔ صنائع وفنون سے دلچسپی رکھنے والے بھی موجود رہے، سائنس اور ٹکنالوجی کے چرچے بھی ہوتے رہے۔ لیکن ان سب کوششوں کے باوجود زندگی اور حیویت سے بھرپور وہ اسلامی تہذیب تشکیل نہیں دی جاسکی جو صدر اسلام کے مسلمانوں نے تشکیل دی تھی۔ اس لیے کہ ذہنی اور فکری طور پر وہ آزادی حاصل نہیں تھی جو ماضی میں مسلمانوں کو حاصل تھی۔

علامہ اقبال نے ایک جگہ بہت لطیف اور بلیغ انداز میں غلامانہ ذہن رکھنے والوں اور آزادانہ ذہنیت رکھنے والوں کی نفسیات کو بیان کیا ہے۔ ان کی ایک طویل نظم ان کی چھوٹی سی کتاب پس چہ باید کرد میں شامل ہے۔ جس کا عنوان ہے "مردحر" یعنی مرد آزاد۔ مردحر کا رویہ اس نظم میں بیان کیا گیا ہے۔ زبور عجم کے ضمیمہ میں انہوں نے ایک چھوٹی سی مثنوی شامل کی ہے جس کا عنوان ہے "بندگی نامہ"۔ اس بندگی نامہ میں انہوں نے غلاموں کے فنون، غلاموں کے آرٹ، غلاموں کی تہذیب وتمدن اور غلام انسانوں کی نفسیات پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ غلام قوم کے جو فنون لطیفہ ہوتے ہیں وہ فحاشی، بے حیائی، مردنی، نقالی، بے مقصدیت اور بے منزلی کے مظہر ہوتے ہیں اور یہ چیزیں مزید غلامی کو جنم دیتی ہیں۔ جب مزید غلامی پیدا ہوتی ہے تو مزید مردنی، مزید بے حیائی، مزید فحاشی، اور مزید بے مقصدیت پیدا ہوتی ہے۔ اس بے مقصدیت سے غلامی مزید پختہ ہوتی ہے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ انہوں نے اس مثنوی میں کہا ہے کہ مرگ ھا اندر فنون بندگی (غلامی کے آرٹ میں موتیں پوشیدہ ہوتی ہے)۔ من چہ گویم از فسون بندگی، بندگی اور غلامی ایک ایسا جادو ہے کہ میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ جب ذہنی اور فکری غلامی کسی قوم میں در آتی ہے تو وہ قوم بے منزل اور بے مقصد ہو جاتی ہے۔

کاروان شوق بے ذوق رحیل
بے یقین و بے سبیل و بے دلیل

اس کی وجہ یہ ہے کہ آزاد تہذیب ہی ہمیشہ غالب تہذیب ہوتی ہے، اور غالب تہذیب ہمیشہ بامقصد ہوتی ہے۔ غلام تہذیب ہمیشہ مغلوب ہوتی ہے اور ہمیشہ بے ہدف اور بے مقصد ہوتی ہے۔ زندگی کو بقاء صرف مقصد اور مدعا سے حاصل ہوتی ہے: زندگی را بقا از مدعا است۔

لہٰذا آزاد باوقار، بااحساس اور ذمہ دار مسلم اقوام کا عروج اور آزاد باوقار باشعور اور مسلم قیادت آج کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ وہ ذمہ دار مسلم قیادت جو امت مسلمہ کو ایک واضح اور بامقصد نصب العین دے سکے۔ کسی نصب العین کی عدم موجودگی میں کوئی قوم قوم نہیں بن سکتی۔ وہ ایک بھیڑ تو ہو سکتی ہے جو کسی منفعت کے حصول یا محض تماش بینی کی خاطر کہیں جمع ہو جائے۔ اس بھیڑ کو پہلے ایک منظم قوم بنانے کے لیے ایک ہدف اور نصب العین درکار ہے۔ پھر ان مسلم اقوام کو مثالی امت مسلمہ بنانے کے لیے ایک عالمی اور بین الانسانی نصب العین متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ علامہ اقبال نے خطبہ الہ آباد میں کہا تھا کہ اسلام خود نصب العین اور منزل مقصود ہے۔ اسلام کو کسی منزل مقصود کی ضرورت نہیں۔

امت مسلمہ کی دیرپا سیاسی آزادی اور بامعنی عسکری اور دفاعی قوت کے حصول کے لیے معاشی خود مختاری درکار ہے۔ مسلمانوں کے لیے معاشی آزادی کے حصول کو فقہاء اسلام نے فرض کفایہ قرار دیا ہے۔ یہ بات میں شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ، امام غزالی اور کئی دوسرے فقہاء کرام کے حوالے سے پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ جب تک مسلمان معاشی طور پر آزاد تھے ان کی تہذیب غالب تہذیب تھی اور مقصدیت کی بنیاد پر قائم تھی۔ جب معاشی آزادی ختم ہو گئی تو ان کی سیاسی طاقت بھی ختم ہو گئی اور ان کی تہذیب ایک غلامانہ تہذیب میں بدل گئی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ از غلامی دل بہ میرد در بدن: یعنی غلامی کی حالت میں دل اندر سے مر جاتا ہے۔ از غلامی روح گردد بارتن: غلامی کی حالت میں روح بوجھ بن جاتی ہے۔ از غلامی شیر غاب افگندہ ناب: جنگل کے شیر غلامی کی حالت میں ایسے ہو جاتے ہیں جیسے دانت گرے ہوئے بوڑھے ہوتے ہیں۔ از غلامی مرد حق زنار بند: غلامی میں مردانِ حق بھی زنار پوش ہو جاتے ہیں۔

آج دیکھ لیں کہ ہر جگہ مردان حق زنار بند نظر آتے ہیں، انگریزوں کی دو سو سالہ غلامی نے ہمتیں اتنی پست کر دی ہیں کہ اب ہندوؤں کی تہذیبی غلامی کی نوبت آنے لگی ہے۔ جس قوم کے آباؤ اجداد نے ایک ہزار سال ہندوستان پر حکومت کی اور یہاں کی غالب ترین اکثریت کے علی الرغم شریعت اور اسلامی تہذیب کو جنوبی ایشیا کی بالادست تہذیبی قوت بنایا ان کے ہاں آج کیا ہو رہا ہے؟ شادی کی کسی تقریب میں جائیں تو لگتا ہی نہیں کہ یہ مسلمانوں کی شادی ہے۔ ہندوؤں کی شادی معلوم ہوتی ہے۔ جو چیزیں ہمارے بچپن میں ہندوانہ رواج کی

وجہ سے ناجائز سمجھی جاتی تھیں وہ آج اسلامی جمہوریہ پاکستان میں مسلمانوں کے گھروں میں پھیل رہی ہیں۔ بے غیرت مسلمانوں نے سونیا گاندھی کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ ہندوستان کو اب کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان کے ٹی وی اور میڈیا نے پاکستان کی ثقافتی آزادی کو ختم کر دیا ہے۔ اس کی یہ بات درست ہے، از غلامی مرد حق زنار بند، جب ذہنی غلامی ہو تو مرد حق زنار باندھنے کے لیے بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ از غلامی گوہرش نا ارجمند۔

یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ یہ ذہنی غلامی کیوں پیدا ہوئی؟ اس سوال کے جواب کے لیے احادیث میں جو کچھ آیا ہے اور اکابر اسلام نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دو طبقوں کی گمراہی، کمزوری اور نالائقی سے یہ صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ مشہور بزرگ گزرے ہیں، اپنے زمانے میں امیر المؤمنین فی الحدیث کہلاتے تھے۔ بڑے بڑے محدثین کے استاد ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے

وهل افسد الدين الا الملوك

واحبار سوء ورهبانها

دین کے معاملات کو دو چیزوں نے خراب کیا، ایک نالائق حکمرانوں نے، دوسرا علماء سوء (یعنی بدکردار اور دنیا پرست علماء) نے۔ جب یہ دو طبقے مسلمانوں میں خراب ہوتے ہیں تو پورا معاشرہ خراب ہو جاتا ہے۔ جب علماء کم فہم ہوں، اور حکمران بدعمل ہوں تو مسلمان امت خرابی کا شکار ہو جاتی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے کہا ہے کہ علماء سوء لصوص دین اللہ (علماء سوء دین کے لیے ڈاکو ہیں۔) یہ مجدد الف ثانی کے الفاظ ہیں۔ کسی عام اور دین سے بے بہرہ آدمی کے الفاظ نہیں ہیں۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ علماء سوء کی صحبت سے ایسے بچو جیسے زہریلے سانپ کے قریب جانے سے بچتے ہو۔

یہ بات کہ علماء کے کردار کو مسلم معاشرے میں دوبارہ زندہ، فعال اور قائدانہ کردار بنایا جائے اور مسلمانوں کی قیادتیں ایسی ہوں کہ جو امت مسلمہ کے ہدف، مقصد اور نصب العین کے بارے میں پوری طرح سے سنجیدہ اور باخبر ہوں۔ یہ دونوں امور امت مسلمہ کے مستقبل کے لیے دنیائے اسلام کی فوری توجہ کے مستحق ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک اور اہم سوال جو فوری توجہ کا مستحق ہے وہ اس سوال کا واضح، دوٹوک اور متوازن جواب ہے کہ مغرب کے بارے میں دنیائے اسلام کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ یہ سوال اسلام کے مستقبل اور خاص طور پر تہذیبی مستقبل کے بارے میں آج ایک اساسی سوال کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج دنیائے اسلام ہر پہلو سے مغرب کے ساتھ برسر پیکار ہے، بلکہ زیادہ واضح الفاظ میں مغرب دنیائے اسلام کے خلاف ہر میدان میں برسر پیکار ہے۔ یہ پیکار اور کشمکش ایک دن میں پیدا نہیں ہوئی، بلکہ یہ روز اول سے قائم ہے۔ بنی عباس کے زمانے سے مسیحی فاضلین نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا تھا۔ انہوں نے اسلام کی تعلیم کے بارے میں اپنے قارئین کو غلط فہمی، کم علمی یا بدنیتی سے غلط نتائج اور غلط تصورات پہنچائے، جس کے نتیجے میں مغرب میں ایک ذہنیت ایسی تشکیل پا گئی جو اسلام کے بارے میں کوئی مثبت بات سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہاں میرا اشارہ مغرب کے عام انسان کی طرف نہیں ہے۔ مغرب کا عام انسان اسی طرح خالی الذہن ہے جیسے مشرق کا عام انسان خالی الذہن ہے۔ میری مراد اس طبقے سے ہے جو مغرب میں فعال قائدانہ کردار رکھتا ہے اور وہاں کی عام رائے عامہ کو مؤثر طور پر کنٹرول کرتا ہے۔

سلطنت عباسیہ کے زمانے میں یوحنا دمشقی جو بڑا فلسفی اور منطقی تھا اور بہت سے مسلمان فلاسفہ نے اس سے کسب فیض کیا۔ اس کو مشرقیات یا اسلامیات کا پہلا مسیحی عالم کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد سے یہ سلسلہ تواتر کے ساتھ جاری ہے۔ صلیبی جنگوں کے دوسو سالوں کے دوران یہ واسطہ اور سابقہ بہت گہرا ہوا۔ بڑے پیمانے پر مغربی فاضلین دنیائے اسلام میں آئے اور انہوں نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا۔ انہوں نے اسلام سے کیا سیکھا؟ اس کا بعض انصاف پسند مغربی مصنفین نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ جارج سارٹن ایسے ہی انصاف پسند اہل علم میں سے ہے۔ تاریخ سائنس پر اس کی متعدد جلدوں میں مشہور کتاب ہے۔ اس میں اس نے ایک ایک مسلمان سائنس دان اور فلسفی کا نام لے کر الگ الگ بتایا ہے کہ کس کے کارنامے کیا ہیں؟ اور اس سے مغرب نے کتنا فائدہ اٹھایا ہے؟ اس کتاب میں اس نے سائنس، ہندسہ، طب، ٹیکنالوجی، فن تعمیر اور اس طرح کے مختلف میدانوں کے بارے میں الگ الگ نشان دہی کی ہے۔ عربی کتابوں میں سے کون کون سی کتابوں کے لاطینی ترجمے ہوئے، کن کن مغربی علماء

نے مراکز اسلام میں تعلیم و تربیت پائی۔ ایسی مثالیں بھی کم نہیں ہیں کہ یورپ کے اونچے مذہبی قائدین نے جن میں کئی پوپ اور بے شمار بشپ شامل ہیں، مسلمانوں کے تعلیمی اداروں میں تعلیم پائی اور اسلام کے بہت سے مذہبی اور تہذیبی تصورات سے واقفیت حاصل کی، ان سے خود متاثر ہوئے اور آگے چل کر انہوں نے ان تصورات کو مغرب میں عام کیا۔ یہ بات بھی اب کوئی اختلافی بات نہیں رہی کہ اصلاح مذہب کی جو تحریک مغرب میں شروع ہوئی تھی جس کے نتیجے میں پروٹسٹنٹ خیالات کو فروغ ہوا، جس کے نتیجے میں پھر آگے چل کر مزید بہت سی تبدیلیاں آئیں اور دنیائے مغرب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا، جس کو وہ روشن خیالی کا زمانہ کہتے ہیں، وہ مسلمانوں کے ہاں سے آنے والے بہت سے مذہبی، فکری اور تہذیبی اثرات کا نتیجہ ہے۔

ان سب اسباب وعوامل کے نتیجے میں جو مغربی تہذیب آج بنی ہے جس سے مسلمانون کا بھرپور اور براہ راست واسطہ ہے، اس تہذیب کی فہم اور اس کے بارے میں صحیح رویہ مسلمانوں کے مستقبل کے لیے ناگزیر ہے۔ وہ زمانہ اب بدل گیا جب بعض حضرات کا یہ خیال تھا کہ مسلمان مغرب سے کٹ کر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ آج دنیا سے کٹ کر زندگی بسر نہیں کی جا سکتی۔ آج وہ حالات نہیں ہیں کہ کوئی ملک اپنے دروازے چاروں طرف سے بند کر دے۔ اپنی حدود پر دیواریں کھڑی کر دے اور باہر کے اثرات کو اندر آنے سے روک دے۔ آپ جتنی اونچی دیواریں چاہیں بنالیں، باہر کے اثرات آپ کے پاس بہرصورت پہنچیں گے۔ کوئی شخص پہاڑوں کے اندر غار بنا کر وہاں بھی رہائش اختیار کر لے، وہاں بھی باہر کے اثرات آئیں گے۔ ان اثرات سے آج کے مسلمان بچ نہیں سکتے۔ اس لیے ان اثرات کے منفی پہلوؤں سے بچنے کے لیے ان اثرات کو جاننا ضروری ہے۔ یہ ادراک ہمارے اپنے تہذیبی مستقبل کے لیے ناگزیر ہے کہ مغربی تہذیب کیا ہے اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ اس کا پس منظر کیا ہے؟ اس کے خصائص کیا ہیں؟ اس کی اخلاقی بنیادیں اور اہداف کیا ہیں؟ اور خاص طور پر روحانی اصولوں، خاندانی اقدار اور معاشرتی رویوں کے بارے میں اس کے رجحانات کیا ہیں؟ وہاں خاندان کا ادارہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا ہے۔ روحانی اقدار غیر متعلق ہو رہی ہیں اور زندگی کے اہم میدانوں سے تقریباً مکمل طور پر انہیں یا تو نکال دیا گیا ہے،

یا بالکل غیر مؤثر کر دیا گیا ہے۔ کیا مسلمانوں کے لیے بھی مغرب سے معاملہ کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری اور مفید ہے؟

دنیائے اسلام میں بھی کچھ لوگ زور وشور سے اس بات کے داعی ہیں کہ مسلمانوں کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے اور مذہب کو زندگی کے تمام اجتماعی پہلوؤں سے نکال کر مسجدوں کی حدود میں بند کر دینا چاہیے۔ لیکن کیا ایسا کرنا ممکن اور قابل عمل ہے۔ اگر بالفرض ایسا کرنا قابل عمل ہو بھی تو کیا یہ مسئلے کا حل ہے؟ بعض مسلم ممالک میں جن میں بہت سے غلامانہ ذہنیت رکھنے والے ''مفکرین'' اور ''قائدین'' نے ایسا کیا، جن کی مثالیں دینی ضروری نہیں، انہوں نے مغربی تصورات کو تھوک کے حساب سے قبول کیا اور اسلامی ماضی کے ہر تعلق کو اپنی ملی زندگی سے کاٹ کر پھینک دیا۔ خود اپنے ماضی سے اپنی آئندہ نسلوں کو ناواقف کر دیا۔ بیک جنبش قلم سب پڑھے لکھے لوگ جاہل قرار پا گئے۔ لیکن کیا مغرب نے ان اقوام وممالک کو اپنے نظام میں برابری کی سطح پر قبول کر لیا؟ واقعہ یہ ہے کہ اس ساری غلامانہ ذہنیت اور یک طرفہ نیازمندی کے باوجود مغرب نے انہیں قبول نہیں کیا۔ اگر یہ سو سالہ تجربہ یا اسی نوے سالہ تجربہ مسلمانوں کے لیے کوئی سبق رکھتا ہے تو اس تجربے سے مسلمانوں کو سبق سیکھنا چاہیے۔ اور مستقبل کی نقشہ کشی میں اس سبق سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ اہل مغرب کا بنیادی زور مظاہر اور معاملات کے ظاہری اور صوری پہلوؤں پر ہے۔ جبکہ اسلامی تہذیب کا اصل زور حقائق اور معاملات کے داخلی اور حقیقی پہلو کی طرف ہے۔ اس کے مختلف اسباب ہیں، جن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ آج مغرب کا سارا آرٹ، مغرب کے سارے علوم وفنون، مغرب کی تہذیب کے تمام چکا چوند کرنے والے مظاہر معاملات کے صوری اور ظاہری پہلوؤں پر زور دے رہے ہیں۔ یہ رویہ اسلامی تہذیب میں کبھی نہیں تھا۔ اس لیے مسلمانوں کی تہذیب میں اکثر وبیشتر وہ ظاہری چکا چوند پیدا نہیں ہوئی جو آج مغرب کا طرۂ امتیاز بن چکی ہے۔ کیا مسلمانوں کو اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں؟

ہمیں اس غرض کے لیے ایک غیر جانبدارانہ اور انتقادی نقطہ نظر کو فروغ دینے کی ضرورت ہے کہ مغرب کے کون سے پہلو ہیں جو مسلمانوں کے لیے مفید اور قابل قبول ہیں اور

کون سے پہلو ہیں جو مسلمانوں کے لیے غیر مفید اور ناقابل قبول ہیں۔ مغرب دنیائے اسلام کے بارے میں اپنا ایک پروگرام اور ایجنڈا رکھتا ہے۔ دنیائے اسلام میں بہت سے لوگ ایسے کسی ایجنڈے کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ ان کو اختیار ہے اگر وہ حقائق سے منہ موڑنا چاہتے ہیں تو ضرور موڑ لیں۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ مغرب کا ایک ایجنڈا ہے جو وہ دنیائے اسلام کے مستقبل کے بارے میں رکھتا ہے۔ اس ایجنڈے کی تفصیلات مغرب کے سیاسی قائدین اور فکری اکابر کی تحریروں میں اور بیانات کی صورت میں وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہتی ہیں۔ اب یہ تمام تفصیلات بہت سی مطبوعہ کتابوں اور رپورٹوں کی صورت میں بہت واضح طور پر موجود ہیں۔ بعض مغربی قائدین نے اپنے بیانات میں یہ عزم ظاہر کیا ہے کہ وہ دنیائے اسلام کے کسی ملک میں شریعت نافذ نہیں کرنے دیں گے۔ اگر انہوں نے ایسا کہا ہے تو یہ ان کے اسی ایجنڈے کا ایک آئٹم ہے۔ یہ ایجنڈا سیاسی بھی ہے، جس سے انکار اب مشکل ہو گیا ہے۔ یہ ایجنڈا تہذیبی اور مذہبی بھی ہے۔

دنیائے اسلام میں بہت سے لوگ اب تک یہ سمجھتے تھے کہ مغرب کا ایجنڈا محض معاشی، سیاسی اور کسی حد تک ثقافتی ہے، اس ایجنڈے کا مذہب اور تہذیب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن اب جو بیانات اہل مغرب کی طرف سے آ رہے ہیں اور اسلامی قوتوں کو جس طرح سے نشانہ بنایا جا رہا ہے اور ہر مسلمان کو جس طرح اصول پسند یا بنیاد پرست قرار دے کر مسلسل حملوں کا ہدف بنایا جا رہا ہے، اس سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ان کا ہدف براہ راست دین اور مذہب ہے۔ ان کے ہاں جو تحریریں پچھلے دس پندرہ سال میں شائع ہوئی ہیں اس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ہر وہ مسلمان جو قرآن پاک کو حقیقی مفہوم میں اللہ کا کلام سمجھتا ہے اور ظاہری مفہوم میں اس کو نافذ کرنا چاہتا ہے وہ بنیاد پرست (fundamentalist) ہے۔ چاہے عملاً نافذ کرتا ہو یا نہ کرتا ہو۔ جو قرآن کو کتاب ہدایت اور زندگی کا دستور العمل سمجھتا ہے اور اس پر عمل کرنے کی خواہش رکھتا ہے وہ بنیاد پرست ہے۔ اس تصور کی رو سے ہر باعمل مسلمان بنیاد پرست قرار پاتا ہے، بلکہ ایک بے عمل مسلمان بھی اگر قرآن کو کتاب الٰہی مانتا ہے تو وہ بھی بنیاد پرست ہے۔

یہ بات اب کوئی ڈھکی چھپی نہیں رہ گئی ہے۔ بنیاد پرستوں کے خلاف جنگ کرنے کے

عزائم اتنی کثرت سے دہرائے گئے ہیں کہ اب یہ بات کوئی راز نہیں رہی کہ ان کا اصل ہدف کیا ہے۔ اب یہ بالکل واضح اور عیاں ہو چکی ہے۔

اہل مغرب کے ہاں فکری یک رنگی موجود ہے۔ پورا مغرب ایک خاص رخ پر چل رہا ہے۔ مسلمانوں کے بارے میں جو رویہ فرانس اور پیرس میں محسوس ہوتا ہے وہی رویہ دوسرے مغربی ممالک میں محسوس ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے بارے میں جو بات امریکہ میں کہی جارہی ہے وہی اٹلی میں بھی کہی جارہی ہے۔ وہی اسپین میں بھی کہی جارہی ہے۔ ان کے ہاں عزم و ارادہ پایا جاتا ہے اور پچھلے دو سو برس سے دنیائے اسلام کے بارے میں وہ اپنے عزائم اور ارادوں کو عملی جامہ پہنا رہے ہیں۔ اس معاملہ میں ان کے حکمرانوں اور عامۃ الناس کے درمیان مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ تعلیم کی سطح ان کے ہاں اتنی اونچی ہے اور ان کے اپنے مقاصد سے اتنی ہم آہنگ ہے کہ دنیائے اسلام کے ممالک میں اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ ان کی معاشی خوشحالی کی بنیاد بڑی مضبوط اور دیرپا ہے۔ وہ خود کفیل ہیں، ان کے پاس بے پناہ عسکری قوت ہے، ان کے ہاں سائنسی تحقیق کے ہزاروں ادارے کائنات کے ذرہ ذرہ اور چپہ چپہ کا سراغ لگا رہے ہیں اور تکریم آدم کا تصور ان کے ہاں ایک حقیقت ہے۔

اس کے مقابلے میں آپ دیکھیں گے کہ دنیائے اسلام کا کوئی واضح نصب العین اور کوئی متعین ہدف نہیں ہے۔ عامۃ الناس کے عزائم اور خواہشات میں جو ہر جگہ یکساں ہیں اور حکمرانوں کے عزائم اور خیالات میں کوئی توافق اور ہم آہنگی نہیں۔ عامۃ الناس کی خواہشات، آرزوئیں اور امیدیں انڈونیشیا سے مراکش تک ایک جیسی ہیں۔ لیکن حکومتوں کا، سیاسی قیادتوں کا اور فکری اور سرکاری سیاسی اور اقتصادی راہنماؤں کا کوئی ہدف نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ فکری الجھنیں عام ہیں۔ کوئی عزم و ارادہ کسی سطح پر موجود نہیں ہے، آپس میں بدترین اختلافات ہیں، تعلیم کی سطح بہت پست ہے، معاشی بنیادیں کمزور ہیں۔ دنیائے اسلام میں جو ممالک بہت خوشحال نظر آتے ہیں، ان کی خوشحالی کی بنیاد بھی کوئی مضبوط اور دیرپا نہیں ہے۔ بہت سی صورتوں میں یہ ظاہری خوشحالی ہے اور بعض بااثر مغربی طاقتوں کی مبنی بر مصلحت سرپرستی کا نتیجہ ہے۔ اس خوشحالی کا کنٹرول اور سوئچ مغربی طاقتوں کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ سوئچ آف کر دیا جائے تو ساری معاشی چکاچوند آنِ واحد میں ختم ہو جائے گی۔ مسلم ممالک کا دوسروں پر

انحصار ہے، اکثر مسلم ممالک عسکری اور سائنسی طور پر کمزور ہیں۔ بے توقیریٔ آدم کے نمونے ہر مسلم ممالک میں کثرت سے نظر آتے ہیں۔ یہ فرق اس وقت ہمارے اور دنیائے مغرب کے درمیان قائم ہے۔ ان حالات میں کیا دنیائے اسلام اور دنیائے مغرب میں مقابلہ برابر کا ہے؟ ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہے۔

مزید برآں انہوں نے دو بڑے تباہ کن تحفے دنیائے اسلام کو دیے ہیں۔ پہلے ایک تحفہ دیا جس کے ذریعے دنیائے اسلام کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ اب دوسرا تحفہ آرہا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ فی الوقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پہلا تحفہ جس کو علامہ اقبال نے اپنے الفاظ میں کہا تھا: "the most dreadful enemy of humanity" کہ میں جس کو اسلام کا سب سے تباہ کن دشمن سمجھتا ہوں وہ ''قومیت اور علاقائی نیشنل ازم کا نظریہ (territorial nationalism)'' ہے۔ اسی علاقائی قومیت نے دنیائے اسلام کو چھوٹے چھوٹے ملکوں اور رجواڑوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا۔ ایک ملک شام کے پانچ ملک بن گئے۔ شام جو قدیم زمانہ سے، اسلام سے پہلے ایک ملک تھا، اب اس کے پانچ ملک بن گئے ہیں اور چھٹا بنانے کا ارادہ ہے۔ جزیرہ عرب آج ایک درجن حکومتوں اور ریاستوں میں تقسیم کیا جا چکا ہے اور مزید تقسیم در تقسیم کے عزائم کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ علاقائی قومیت کے اس عفریت کو جتنا ہم اہل پاکستان جانتے ہیں شاید کم لوگ جانتے ہوں۔

نیشنل ازم نے جو حال مسلم ممالک کا کیا ہے اس سے مسلمانوں کو ابھی تک سبق نہیں ملا۔ دو سو سال کے طویل اور تکلیف دہ تجربات بھی انہیں کوئی سبق نہیں سکھا سکے۔ اب جو مزید تحفہ دیا جا رہا ہے یا زبردستی مسلط کیا جا رہا ہے وہ سیکولر ازم ہے جس کے ذریعے مسلمانوں میں موجود تھوڑی بہت اسلامی اقدار اور اخلاقیات سے ان کی وابستگی کو بھی مٹا دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ آج سے تقریباً 25 سال قبل یہ بات ناقابل فہم تھی اور کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ پاکستان میں سیکولر ازم کی بات کی جائے گی، سعودی عرب میں تعلیم کو جدید بنانے کے نام پر اسلامی اثرات سے پاک کرنے کی بات کی جائے گی، مصر میں جامعۃ الازہر کے کردار کو ختم کرنے کی بات کی جائے گی۔ چوتھائی صدی پہلے یہ سب کچھ کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ لیکن آج دنیائے اسلام کے ہر ملک میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ مجھے کئی ملکوں میں براہ راست

جا کر مشاہدہ کا اتفاق ہوا ہے۔ جو باتیں آج کل پاکستان میں تعلیم کے بارے میں کہی جاتی ہیں بعینہ وہی باتیں مصر کی جامعۃ الازہر میں بھی کہی جا رہی ہیں۔ جن ''دلائل'' کا سہارا لے کر پاکستان کی تعلیمی اداروں میں نصابات سے اسلامی عناصر کو نکالا جا رہا ہے، وہی ''دلائل'' عرب دنیا میں دہرائے جا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی نسخہ ہے جو مختلف زبانوں میں لکھ کر مختلف ملکوں میں بھیجا جا رہا ہے۔ انہی ''دلائل'' کی بازگشت خالص اسلامی اداروں میں بھی سنی جا رہی ہے۔

یہ وہ صورت حال ہے جس میں ہمیں اپنے موقف کا تعین کرنا ہے۔ اس کام میں بہت سے مشکل مقامات بھی آتے ہیں۔ وہ مشکل مقامات فوری توجہ اور فیصلہ کا متقاضی ہیں۔ کون سی چیز ایسی ہے جس میں مسلمان فی الحال کمزوری یا صرفِ نظر سے کام لے سکتے ہیں؟ کون سے معاملات ہیں جن میں ایک لمحے کے لیے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا یا کمزوری نہیں دکھائی جا سکتی؟ ان سب باتوں کا ایک سنجیدہ، متوازن، غیر جذباتی اور خالص علمی انداز میں جائزہ لینا ضروری ہے۔ لیکن مسلمان تو اس کے لیے شاید تیار ہو جائیں، کیا اہل مغرب بھی اس کے لیے تیار ہیں کہ سنجیدگی کے ساتھ یہ طے کریں کہ مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ کیا ہوگا؟ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں اور یہ انتہائی سفاہت کی بات ہے، میں اس کو انتہائی بے وقوفی کی بات سمجھتا ہوں کہ اسلام اور مغرب کے درمیان جو دشمنی موجودہ دور میں نظر آتی ہے یہ ماضی قریب کے کچھ واقعات کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دشمنی محض ماضی قریب کے چند واقعات کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ دشمنی خالص مسیحی دور میں بھی رائج تھی، جب یورپ کی سرزمین پر خالص مسیحی حکومت قائم تھی۔ جب پوپ اور کرسچن رومن ایمپائر، ہولی رومن ایمپائر کا زمانہ تھا، اس وقت بھی یہ دشمنیاں زور و شور سے قائم تھیں۔ اس دشمنی میں جو شدت صلیبی جنگوں کے زمانے میں تھی وہ شدت آج بھی موجود ہے۔ صلیبی جنگوں کے حوالے آج بھی کبھی کبھی مغربی قائدین کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتے ہیں۔ یہ مخالفت آج کے خالص عقلی اور سائنسی دور میں بھی جاری ہے، استعماری دور میں بھی جاری رہی اور پھلتی پھولتی رہی۔ جمہوریت، عدل، مساوات اور احترام آدم کے نعروں کی گونج میں بھی مخالفت کی یہ لے بڑھ رہی ہے۔ یہ مخالفت ظاہر ہے خالص نسلی انداز کی ہے۔ یہ ایسی مخالفت ہے جس میں مذہبی یورپ اور سیکولر یورپ، مذہبی

مغرب اور سیکولر مغرب دونوں متفق الرائے چلے آرہے ہیں۔ وہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو مذہبی انداز رکھتے ہیں۔ کچھ لوگ خاص سیکولر انداز کے حامل ہیں۔ لیکن مسلمانوں سے مخالفت اور دشمنی میں دونوں برابر ہیں۔

یہ بات کہ اہل مغرب دنیائے اسلام کے بارے میں ایک ایجنڈا رکھتے ہیں، بالکل واضح ہے۔ لیکن وہ ایجنڈا آج کا نہیں ہے، بہت پرانا ہے۔ اس ایجنڈے کے مظاہر میں سے ایک مظہر یہ بھی ہے کہ ایسے تمام اسلامی تصورات کو جوان کے بین الاقوامی ایجنڈے کے راستے میں رکاوٹ بن سکتے ہوں ایک ایک کر کے مٹایا جائے۔ چنانچہ وہ پہلے کسی ایک اصطلاح کو جو کسی خاص تصور یا نظریے کی نمائندہ اور ترجمان ہو، منتخب کرتے ہیں اور اس پر پوری قوت سے حملہ آور ہوتے ہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل اور انیسویں صدی کے اواخر کی تحریریں اگر دیکھی جائیں (بعض تحریریں دستیاب ہیں) تو ان کا ہدف خلافت کا ادارہ ہوا کرتا تھا۔ خلافت اور pan islamism پان اسلام ازم کے الفاظ گالی ہوا کرتے تھے۔ وہ ہر بڑے مسلمان لیڈر سے پوچھتے تھے کہ کیا آپ pan islamism کے علمبردار ہیں؟ اس سوال کے جواب میں مسلم قائدین اسی طرح گول مول جواب دیا کرتے تھے جس طرح ہمارے لیڈر آج بنیاد پرستی یا fundamentalism کے بارے میں جواب دیتے ہیں کہ نہیں جی میں تو سیدھا سادہ مسلمان ہوں، بنیاد پرست نہیں ہوں۔ علامہ اقبال، قائداعظم، حتی کہ مفتی اعظم فلسطین اور سعید حلیم پاشا سے بار بار یہی پوچھا گیا۔ جتنے مسلمان قائدین کا مغرب سے کوئی سابقہ پیش آیا ان سے یہ سوال پوچھا جاتا تھا کہ آپ pan islamism کے قائل ہیں؟ تو وہ اس کا کوئی خاص مفہوم قرار دے کر جواب دے دیا کرتے تھے۔ جب عالمی حلقوں میں ایک مرتبہ یہ ذہن بن گیا کہ بین الاقوامی اور عالمگیر مسلم برادری کے تصور کو ختم کرنا ہے تو پھر براہ راست خلافت کے ادارے کو ہدف بنایا گیا۔ اس سے قبل انیسویں صدی کے آغاز سے جہاد کے ادارے کو ہدف بنایا گیا تھا۔ امیر المؤمنین اصطلاح کو ہدف بنایا گیا۔ یہ ساری اصطلاحات ہی مضحکہ خیز بنا دی گئیں۔ یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ آج ہمارے ہاں پاکستان میں بعض سیاسی قائدین امیر المؤمنین کے لفظ کو بطور گالی کے استعمال کرتے ہیں۔ اخباروں کے تبصروں میں آئے دن یہ جملہ نظر آتا ہے کہ فلاں صاحب امیر المؤمنین بننا چاہتے تھے، فلاں وزیر اعظم یا فلاں قائد امیر

المؤمنین بننا چاہتا ہے۔کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ کیا امیر المؤمنین بننا کوئی بری بات ہے؟ کوئی گالی ہے؟ یا منفی بات ہے؟ کوئی شخص اہل ایمان کا قائد بننا چاہتا ہے تو بہت اچھی بات ہے۔لیکن اس اسلامی اصطلاح کو گالی بنادیا گیا۔خلافت کی اصطلاح گالی بنادی گئی۔خلافت کی بات اب کوئی نہیں کرتا۔ جہاد کا لفظ تقریباً گالی بنادیا گیا۔حتی کہ جہاد کا نام لینے والے، جہاد کے نام پر جینے والے، جن کے نعروں میں جہاد اور تقویٰ اور پتہ نہیں کیا کیا اچھی باتیں لکھی ہوئی ہیں، وہ بھی اب جہاد کی بات نہیں کرتے۔حدود کے لفظ کو گالی بنادیا گیا۔آئندہ اس طرح کی اور بے شمار اصطلاحات کو نشانہ بنایا جائے گا۔ پتہ نہیں ابھی تھیلی میں اور کیا کیا ہے؟ یہ سب کچھ محض اصطلاح پر حملے کی بات نہیں ہے۔یہ شریعت کے تصور کو ایک ایک کر کے محدود اور بالآخر ذہنوں سے محو کرنے کی بات ہے۔

مغرب سے اس encounter کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری ترجیحات اور اولویات میں اختلال پیدا ہوگیا۔ترجیحات ہر تہذیب کی الگ ہوتی ہیں۔جس اساس پر ہر تہذیب قائم ہوتی ہے اسی اساس کی بنیاد پر قوم اپنی اولویات یا ترجیحات کا تعین کرتی ہیں۔آج مغرب میں روحانی واخلاقی اقدار کی حیثیت ثانوی ہے۔عقائد کی حیثیت ثالثی ہے اور مادیات کی حیثیت اولین ہے۔ اسلام میں یہ ترتیب اس کے الٹ ہے، یعنی عقائد و اخلاقیات اور روحانیات کی اولین، اجتماعیات کی ثانوی اور مادیات کی ثالثی ہے۔

یہ وہ بڑا چیلنج ہے جو مسلمانوں کو درپیش ہے۔جس چیز نے مسلمانوں کی تہذیب کو عالمگیر اور فعال تہذیب بنایا تھا وہ علم اور عدل تھے۔علم کی آزادی اور عدل کی بے لاگ فراہمی دنیائے اسلام کا طرۂ امتیاز رہی ہیں۔آج ضرورت ہے کہ عدل اور علم کی آزادی کو بحال کیا جائے اور اسلام کے تہذیبی اور تمدنی ہدف کا تعین ان بنیادوں پر کیا جائے جو میں نے گزشتہ سطور میں عرض کی ہیں تو اُمت مسلمہ کے مستقبل کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔

اسلام کی تعلیم کی رو سے علم اور عدل دونوں فطری طور پر انسانوں کے اندر ودیعت کر دیے گئے ہیں۔طلب علم کا جذبہ بھی فطری ہے اور اس فطری تقاضے کی تکمیل کے لیے جتنے بھی آلات اور وسائل درکار ہیں وہ بنیادی طور پر ہر انسان کو عطا کئے گئے ہیں۔طلب علم کے دواعی اور محرکات ہر انسان کی طبیعت میں جبلی طور پر موجود ہیں۔ظاہر ہے کہ علم کسی حقیقت ہی کا ہوسکتا

ہے۔علمائے اسلام نے علم کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں بہت تفصیل سے کلام کیا ہے۔ کسی چیز کی حقیقت کا ادراک جب مکمل طور پر ہو جائے اس کو علمائے اسلام علم سے تعبیر کرتے ہیں۔علم کے لئے ضروری ہے کہ ایک عالم ہو جو علم حاصل کر رہا ہو یا جس کو علم حاصل ہو چکا ہو۔ ایک معلوم یعنی وہ حقیقت یا چیز ہو جس کا علم حاصل کیا جائے۔پھر عالم میں حصول علم کی استعداد کا ہونا ناگزیر ہے، اس کے اندر یہ صلاحیت موجود ہو کہ وہ علم کو حاصل کر سکے۔پھر سب سے اہم بات جس کا تعلق اسلامی شریعت کے علم سے بہت گہرا ہے وہ یہ ہے کہ جو چیز معلوم کی جارہی ہے وہ معلوم ہونے کے قابل بھی ہو۔

انسان جن ذرائع سے علم حاصل کرتا ہے، جن کا پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے، وہ تجربہ، مشاہدہ، عقل اور خبر صادق ہے۔اب اگر کوئی حقیقت ان ذرائع علم سے ماوراء ہے، مثلاً اللہ تعالی کی ذات کے بارے میں بہت سے حقائق ہیں۔غیبیات کے بارے میں بہت سے حقائق ہیں۔ان حقائق کا علم حاصل کرنا ان وسائل علم کے ذریعہ مکمل طور پر ممکن نہیں ہے۔یہ حقائق ان وسائل علم سے بالکل ماوراء ہیں۔اس لیے ان حقائق کے بارے میں جتنا علم حاصل ہوسکتا ہے وہ انہی ذرائع سے حاصل ہوسکتا ہے جو خود خالق کائنات نے فراہم کیے ہیں، خبر صادق اور وحی، اس ایک ذریعہ کے علاوہ ان بڑے حقائق کا علم حاصل ہونا ممکن نہیں ہے۔

فقہائے اسلام نے بالخصوص اور دوسرے مفکرین اسلام نے بالعموم علم کی ایک خاص نوعیت کے لیے فقہ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ایک تو فقہ کے معنی وہ ہیں جو اصطلاحی طور پر شریعت کے عملی احکام کے مجموعے کو کہا جاتا ہے۔لیکن فقہ کے ایک اور معنی پوری شریعت میں عمومی طور پر تفقہ اور گہرا ادراک حاصل کرنے کے بھی آتے ہیں۔

سیدنا علیؓ بن ابی طالب سے ایک مشہور جملہ منسوب ہے جو علوم وفنون کی تاریخ اور اقسام پر لکھنے والے متعدد مصنفین نے بیان کیا ہے۔سیدنا علیؓ بن ابی طالب کا ارشاد ہے کہ دراصل وہ علوم جو انسان کو حاصل کرنے چاہئیں ان کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ایک تو وہ علم ہے جس کو جناب والا نے فقہ کا نام دیا ہے۔یہ وہ علم ہے جو ادیان کی یعنی شریعت کی اور عقائد، اخلاق اور روحانیت کی پوری فہم سے عبارت ہے، جسے قرآن حکیم نے تفقہ فی الدین کے نام سے یاد کیا ہے۔لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ انسان کے جسمانی معاملات سے متعلق جو علوم وفنون ہیں

ان کو طب کے عمومی دائرے میں شامل کیا ہے۔تعمیرات سے متعلق سارے علوم وفنون بالواسطہ یا بلاواسطہ ہندسہ Engineering کہلاتے ہیں۔زبان سے متعلق جتنے علوم وفنون ہیں ان کے لیے نحو کی اصطلاح استعمال کی ہے۔اور زمانے اور وقت کا اندازہ کرنے کے لیے جتنے علوم و فنون ہیں ان کے لیے نجوم کی اصطلاح استعمال کی ہے۔گویا فقہ، طب، ہندسہ، نحو اور نجوم یعنی سیاروں کا، کائنات کی قوتوں کا، اخلاق کا اور روئے زمین سے ماوراء کائنات اور کہکشاؤں کا علم ضروری ہے اور زمان ومکان کی حقیقت کو جاننے کے لیے ناگزیر ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ انسانی تہذیب وتمدن کی بنیادی ترقی کے لیے یہ سب علوم وفنون اسی ترتیب سے حاصل کئے جائیں گے تو انسانی تہذیب وتمدن کامیاب ہوگی۔اگر کسی معاشرے میں، کسی تہذیب میں یہ ترتیب بدل جائے تو پھر وہ توازن قائم نہیں ہوسکتا جو اسلامی شریعت قائم کرنا چاہتی ہے۔

اسلام کے مزاج میں اور اسلامی تہذیب کی حقیقت میں یہ بات شامل ہے کہ علوم وفنون میں بنیادی کردار اور اساسی کردار علوم دینیہ اور ان علوم کا ہونا چاہیے جن کی تدوین وترتیب میں دینی تعلیمات بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔جو معاملات خالص تجربہ یا بنیادی طور پر انسانی عقل سے تعلق رکھتے ہیں جن کے لیے علمائے اسلام نے صنائع اور فنون کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ان میں بنیادی دینی تعلیمات یا اخلاقی اصولوں کا کردار بہت محدود ہے۔انسان تجربے سے یہ معلوم کرسکتا ہے کہ پیداوار کیسے بڑھائی جائے؟ زراعت کو کیسے ترقی دی جائے؟ ہندسہ اور انجینئرنگ کے میدانوں میں کامیابیاں کیسے حاصل کی جائیں؟ عمل جراحی اور طب کے دوسرے معاملات میں بہتری کیسے حاصل کی جائے؟ یہ سب وہ معاملات ہیں جن کا تعلق تجربے یا انسانی عقل سے ہے۔یہاں دینی رہنمائی سے یہ تو پتہ چل سکتا ہے کہ ان تجربات کے نتیجے میں جو کامیابیاں حاصل ہوں ان سے استفادہ کیسے کیا جائے؟ ان تحقیقات اور انکشافات کو انسانی فلاح وبہبود کے لیے کیسے استعمال کیا جائے؟ اس حد تک تو دینی تعلیم اور اخلاقی قواعد و ضوابط کا ان علوم وفنون سے تعلق ہے۔اس محدود کردار کے علاوہ یہ وہ معاملات ہیں جو خالصتاً عقل اور تجربے سے تعلق رکھتے ہیں۔ایسے ہی معاملات کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ انتم أعلم بأمور دنیاکم یہ دنیاوی تجربے اور انتظامی معاملات ہیں ان کو تم بہتر سمجھتے

ہو۔اس طرح کے امور کے لیے وحی الٰہی کی رہنمائی درکار نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ کی وحی یہ بتانے کے لیے نہیں آئی کہ پل کیسے بنایا جائے؟ سڑکیں کیسے بنائی جائیں؟ بیماری کا علاج کیسے کیا جائے؟ یہ کام تو انسان اپنی عقل اور تجربے سے خود کرسکتا ہے۔یہ کام مسلمان بھی کرسکتا ہے اور غیر مسلم بھی کرسکتا ہے۔

لیکن ان علوم وفنون کے علاوہ بعض علوم وفنون ایسے ہیں جو براہ راست انسان کی نفسیات پراثر انداز ہوتے ہیں۔انسانی اور اجتماعی علوم،یعنی Humanities اور Social Sciences۔ان علوم کے بارے میں اسلامی تہذیب ہمیشہ حساس رہی ہے۔اس لئے کہ انسانوں کے مزاج،انسانوں کی تہذیب اور تمدن پر یہ علوم غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔آج بھی سائنس اور ٹکنالوجی کے سارے چرچوں کے باوجود عمومی طور پر جو فکری قیادت ہے،ذہن سازی کا جو بنیادی کام ہے وہ انسانی اور اجتماعی علوم کے ذریعے سے ہورہا ہے۔اس لیے اگر اسلامی تہذیب نے علوم انسانیہ اور اجتماعیہ کی اہمیت کا احساس کیا تو بالکل ٹھیک کیا۔ مستقبل میں دنیائے اسلام کی تعلیم کی نوعیت اور کردار کا تعلق جہاں اسلامی علوم کی صحیح اور مناسب تعلیم وتربیت سے ہے وہاں اجتماعی اور انسانی علوم کی تدوین نو،تشکیل جدید اور نئے انداز سے تعلیم وتربیت پر بھی ہے۔ان دونوں کے بعد درجہ آئے گا سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم کا۔سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم دنیائے اسلام کے مختلف ممالک میں مختلف ہے۔ہر ملک کی صلاحیتیں اور ضروریات مختلف ہیں۔بعض علوم کی صلاحیت بعض ممالک میں پائی جاتی ہے دوسرے ممالک میں نہیں پائی جاتی۔یہ وہ معاملات ہیں جو جدید دنیائے اسلام کو ترجیحی طور پر باہمی مشاورت اور ماضی قریب کے تجربے کی روشنی میں طے کرنے چاہئیں۔ان سوالات میں بنیادی سوالات دو ہیں۔سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم کیسے دی جائے اور کن کن میدانوں میں دی جائے؟ کیوں کا سوال یہاں نہیں ہے۔اس لیے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم ناگزیر ہے،اس لیے کہ آج دنیا میں اسی کا چلن ہے اور اسی پر مستقبل کی تعمیر کا بڑی حد تک دارومدار ہے۔

جب مغربی دنیا میں سائنسی علوم کا چلن نہیں تھا اس وقت بھی مسلمان علماء نے حقائق کائنات پر غور کرنا اور ان میں پنہاں اللہ کی حکمت اور مشیت کے حقائق او اسرار ورموز کو دریافت کرنا اپنی ذمہ داری سمجھا،اسلام کی تاریخ میں جو حضرات دینی علوم میں نمایاں تھے،

روحانیات میں نمایاں تھے، ان میں سے بہت سے سائنس اور ٹیکنالوجی میں بھی نمایاں تھے۔ مشہور صوفی بزرگ حضرت ذوالنون مصری اپنے زمانے کے صف اول کے سائنس دانوں میں تھے۔ مشہور فقیہ اور امام اصول امام ابوالعباس قرافی جہاں اصول فقہ اور شریعت کی مزاج شناسی میں انتہائی نمایاں اور بلند مقام کے حامل ہیں وہاں وہ اپنے زمانے کے صف اول کے سائنسدان بھی تھے۔ اس لیے سائنس کی تعلیم میں کیوں کا سوال تو پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن کیسے کا سوال ضرور پیدا ہوتا ہے اور یہ سوال پیدا ہونا چاہیے کہ یہ تعلیم کن کن میدانوں میں دی جائے؟ ترجیحات کیا ہوں؟ یہ ترجیحات دنیائے اسلام کے مختلف علاقوں میں مختلف ہو سکتی ہیں۔

علوم کی تعلیم کے بعد ضرورت ہے کہ دنیائے اسلام میں صنائع کی تعلیم بھی دی جائے اور فنون کی تعلیم بھی دی جائے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے بہت سے میدان وہ ہیں جن کا تعلق صنعتوں سے ہے۔ کچھ میدان وہ ہیں جن کا تعلق فنون سے ہے۔ لیکن فن کی اسلامی اصطلاح میں سائنس اور ٹکنالوجی کے ساتھ ساتھ بعض ایسے لطیف میدان بھی شامل ہیں جن کو آج کی زبان میں آرٹ یا محدود مفہوم میں فن کہا جاتا ہے۔ یعنی اظہار ذات اور جذبات درون سینہ کی ترجمانی، اس کا نام آج کل کی زبان میں آرٹ یا فن قرار دیا جاتا ہے۔ ذات اگر آزاد ہو، بلند پرواز ہو اور اپنی نظر کے اعتبار سے عالمگیر ہو، اپنی بلندی فکری کے اعتبار سے افلاکی ہو تو پھر اس کے فن میں یہ بات جھلکنی چاہیے، اس کے فن میں آزادی، بلند پروازی، عالمگیریت اور افلاکیت رچی بسی ہونی چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ فرد اپنی ذات کا اظہار نہیں کرتا، وہ دوسرے کی ذات کا اظہار کرتا ہے، وہ اپنے جذبات کی ترجمانی نہیں کرتا، وہ دوسرے کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔

آج آپ دیکھ لیں کہ دنیائے اسلام میں خالص آرٹ اور فنون کے میدان میں کیا ہو رہا ہے؟ فن تعمیر میں کس کی نقالی ہو رہی ہے۔ بقیہ فنون میں کس کی نقالی ہو رہی ہے۔ قدیم اسلامی فنون مثلاً خطاطی کیوں نظر انداز کی جا رہی ہے؟ ان سوالات کا جواب واضح طور پر یہ ہے کہ آج چونکہ فن کا تعلق آزادی، بلند پروازی، اور مسلمانوں کے اپنے ماضی، ذات، اور شخصیت سے نہیں رہا، اس لیے اس کا اظہار غلط انداز میں ہو رہا ہے۔

جس زمانے میں مسلمان فن تعمیر میں امامت کا درجہ رکھتے تھے، اس زمانے میں جو جو

عمارتیں انہوں نے بنائی ہیں، جہاں جہاں بنائی ہیں۔ وہ اس علاقے اور اس ملک کے موسم اور وہاں کے لوگوں کی ضروریات کے عین مطابق ہیں۔ گرم ترین علاقوں میں بنائی جانے والی عمارتیں، دہلی اور لاہور جیسے گرم علاقوں میں جو عمارتیں بنائی گئی ہیں۔ وہ آج بھی جیسے گرمی میں راحت اور آرام کا سامان پہنچاتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں آج آپ اسلام آباد کو دیکھ لیجیے۔ کراچی اور لاہور میں دیکھ لیجیے ہمارے غلام معماروں نے غلامانہ ذہنیت رکھنے والے ماہرین فن نے جو عمارتیں بنائی ہیں وہ نہ موسم کے لحاظ سے بنائی گئی ہیں، نہ ہمارے ورثہ اور ضروریات کو سامنے رکھ کے بنائی گئی ہیں، نہ ہمارے وسائل اور سہولتوں کو سامنے رکھ کر بنائی گئی ہیں۔ عمارتوں کے نقشے وہ ہیں جو لندن میں بنتے ہیں۔ عمارتیں بنائی جارہی ہیں لاہور میں، جہاں سال کے دس مہینے شدید گرمی پڑتی ہے۔ وہ گرمی جس کا اہل مغرب تصور نہیں کر سکتے۔ نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ تکلیف، پریشانی، بجلی کا شدید خرچہ، بجلی پر جو بوجھ ہمارے ملک میں پڑا ہوا ہے۔ اس کی ایک بہت بڑی وجہ وہ عمارتیں بھی ہیں جو غلامانہ ذہنیت رکھنے والے ماہرین تعمیر نے اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والے مالکان عمارات نے بنوائی ہیں۔

ان سب امور کا تعلق محض کسی شخص کی ذاتی پسند ناپسند سے نہیں ہے۔ اس کا تعلق اقوام کی نفسیات اور مزاج سے ہے۔ اس کا تعلق نظریہ علم سے ہے۔ Epystemology دراصل وہ کانٹا ہے جو فکری ٹرین یا قافلہ فکر کی منزل کو بدل دیتا ہے۔ ٹرین مشرق کی طرف جارہی ہو تو یہ کانٹا اس کا رخ بدل کر مغرب کی طرف موڑ سکتا ہے۔ آج ہمیں سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اسلام کے نظریہ علم کو دور جدید کے تقاضوں کے مطابق بیان کریں، دور جدید کی زبان اور اصطلاحات میں اس کو پیش کریں تاکہ اس نظریہ علم کے بدل جانے سے اور سیکولر مغربی نظریہ علم سے اثر لینے کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں ان مسائل کا تدارک کیا جا سکے۔ اہل مغرب کے نزدیک جو نادیدہ ہے وہ ناموجود ہے۔ جو دیدہ ہے وہ موجود ہے۔ علامہ اقبال نے بڑے خوبصورت انداز میں اس کمزوری کو بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

ماہیاں را کوہ و صحرا بے وجود
بہر مرغاں موج دریا بے وجود

اگر یہ بات مان لی جائے کہ اگر آپ کو کوئی حقیقت نظر نہیں آ رہی تو وہ غیر موجود ہے تو پھر

اگر مچھلیاں یہ کہیں کہ صحرا کا کوئی وجود نہیں ہے، اس لیے کہ مچھلیاں اس کو نہیں دیکھ سکتیں، اور باغوں میں اڑنے والے پرندے اگر یہ کہیں کہ سمندر کی گہرائیوں میں جو مناظر بتائے جاتے ہیں۔ وہ کوئی وجود نہیں رکھتے تو یہ کہنا ان کے لیے حق بجانب ہوگا۔ مولانا روم نے بھی یہ بات ایک جگہ لکھی ہے اور ان کی تشبیہ بھی غیر معمولی طور پر بلیغ ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر کوئی بچہ پیدائش سے پہلے اس دنیا میں آنے سے انکار کرے اور یہ کہے کہ اس کے محدود اور تنگ و تاریک ماحول سے باہر کوئی دنیا وجود نہیں رکھتی، جن جن چیزوں کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ سب کی سب بے بنیاد ہیں، چونکہ نادیدہ ہیں اس لیے غیر موجود ہیں تو جتنا عقل و فہم پر مبنی وہ خیال ہوگا اتنا ہی عقل و فہم پر مبنی یہ خیال محسوس ہوگا جب کائنات کے حقائق سامنے آئیں گے، جب عالم غیب عالم مشاہدہ میں تبدیل ہو جائے گا۔

یہ تصور اگر ایک مرتبہ اپنا لیا جائے کہ جو نادیدہ ہے وہ ناموجود ہے تو پھر سارا زور رنگ اور آواز پر مرکوز ہو جاتا ہے۔ رنگ اور آواز ہی دراصل وہ دو بڑے مظاہر ہیں جن کی وجہ سے مادیات کا وجود محسوس ہوتا ہے۔ مادیات کا ادراک عامۃ الناس کو رنگ اور آواز ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ اگر رنگ اور آواز دونوں چیزیں ختم ہو جائیں تو بہت سے لوگوں کے لیے بہت سی چیزوں کا وجود بے معنی ہو جائے گا۔ علامہ اقبال نے اس مضمون کو کئی جگہ اپنے کلام میں بیان کیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ

مرد کر سوز نوارا مردہ اے
لذت صوت و صدا را مردہ اے

ایک بہرے آدمی کے لیے ہر صوت و صدا بے معنی ہے، ہر لطیف سے لطیف آواز کی لذت اس کے لیے نادیدہ اور ناشنیدہ ہے، لہٰذا ناموجود ہے۔

پیش چنگے مست و مسرور است کور
پیش رنگے زندہ درگور است کور

ایک نابینا آدمی کے لیے آواز کا جادو جگایا جا سکتا ہے۔ لیکن رنگوں کی خوبصورتی اور ظاہری جلوہ آرائیاں اس کے لیے بے معنی ہیں۔ وہ ایسا ہی ہے جیسے زندہ درگور ہو۔ ایک اور جگہ اردو میں بہت خوبصورت انداز میں اس مضمون کو بتایا ہے۔ لکھا ہے:

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
کہ بلبل فقط آواز ہے طاؤس ہے فقط رنگ

ان مثالوں سے یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ اسلام میں جس چیز کو آرٹ کہا گیا یا کہا جا سکتا ہے اس کو زندگی اور انسانیت کے تابع اور ان کا خادم ہونا چاہیے، انسانیت و زندگی کا مخدوم نہیں بننا چاہیے، اس لیے کہ کائنات میں خالق کائنات کے بعد سب سے برتر، سب سے محترم اور سب سے مکرم وجود خود انسانیت کا ہے۔ بقیہ ہر چیز انسانیت کی خدمت کے لیے ہے، انسانیت ان کی خدمت کے لیے نہیں ہے۔ انسانیت تو وہ ہے جس کے روبرو ملائکہ بھی سربسجود ہیں۔ لہٰذا اسلامی تہذیب کا مزاج یہ ہے کہ ہر وہ فن یا علم جو انسان کو اپنا خادم اور تابع بنا لے وہ ناقابل قبول ہے۔ ایسا آرٹ اسلامی تہذیب کی روشنی میں بت پرستی اور بت گری کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی تاریخ میں جو ادبیات اور فنون لطیفہ پیدا ہوئے، ان کا مظاہرہ ان میدانوں میں زیادہ ہوا جن میدانوں میں یہ فنون انسانیت کے خادم بن سکتے تھے، زندگی کے خادم بن کر کام کر سکتے تھے، اسلام کے اہداف اور مقاصد کو آگے بڑھانے میں ممد و معاون ہو سکتے تھے۔ خطاطی، جلد سازی، فن تعمیر، باغات، ظروف سازی، شعر و ادب، خطابت، یہ وہ بڑے بڑے میدان ہیں جن میں مسلمانوں کے فنون لطیفہ کا سب سے زیادہ اظہار ہوا۔ اسلامی تاریخ میں موسیقی اور تصویر سازی بھی رہی ہے، لیکن وہ بہت محدود سطح پر رہی ہے اور وہ بھی بعض ایسے اعتبارات کی پابند رہی ہے جن کی اساس اور بنیاد اسلام کے عقائد اور شریعت کے مقاصد میں تھی۔

اسلامی تہذیب میں ہر فن اور ہنر انسانی زندگی میں مثبت تبدیلیاں پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ انسانوں کو بلند مقاصد کے لیے کاربند رکھنے کا ایک بہت بڑا محرک ہے، اگر کسی فن کے نتیجے میں تہذیبی زوال آئے، مقاصد سے نظر ہٹ جائے، بلندیٔ فکر مجروح ہو جائے تو وہ فن قابل قبول نہیں ہے۔

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

علامہ اقبال نے ایک جگہ لکھا تھا کہ مجھے یقین ہے کہ فن تعمیر کے سوا ابھی تک اسلام کا صحیح

فنِ موسیقی، مصوری اور شاعری کے باب میں وجود میں نہیں آیا۔ یعنی ایسا فن جس کی بنیاد صفات الٰہی کو انسان کے اندر سمو لینے پر ہو انگریزی میں یہ جملہ انہوں نے یوں کہا۔

The art which aims at the human assimilation of the divine attributes.

یہ ہے آرٹ اور فن کے بارے میں اسلام کا مزاج اور اسلامی تہذیب کا رجحان و رویہ۔ یہ کیفیت ادبیات میں بھی نمایاں محسوس ہوتی ہے۔ اسلامی ادبیات کا انداز ہی اور ہے، اسلامی ادبیات کا دورِ زوال میں جائزہ لیا جائے تو اس کا مزاج اور ہے۔ یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ مسلمانوں کے دورِ زوال اور اسلامی تہذیب کے دورِ انحطاط میں جو صنفِ سخن سب سے زیادہ مقبول ہوئی وہ غزل ہے۔ مغربی ادبیات کی جو چیز سب سے زیادہ مقبول ہوئی وہ ڈراما تھا۔ ڈرامے میں ظاہر پرستی، مظاہر کی پابندی جتنی نمایاں ہے وہ کسی اور صنفِ سخن میں نمایاں نہیں ہے۔ غزل میں جو داخلیت اور حقیقت ہے وہ کسی اور صنفِ سخن میں نہیں ہے۔ اپنے تمام تر دورِ زوال کے باوجود، اپنی تمام تر کمزوری اور انحطاط کے باوجود اسلامی ادبیات نے بالخصوص مشرق میں غزل کی جو صنف اپنائی اور جس انداز سے ترقی دی وہ اسلامی تہذیب کی داخلیت کا ایک بھرپور اظہار ہے۔ اس حقیقت کا کہ اسلام کا مزاج اشیاء پر غور کرنے کا ہے اور حقائق کے ادراک پر معاملات کا دارومدار رکھنے پر ہے، ظواہر پر اسلام کا اور اسلامی تہذیب کا دارومدار نہیں ہے۔

اور تو اور اسلام نے خالص تفریحی امور کو بھی اپنی اس حقیقت سے باہر نہیں جانے دیا۔ تفریح اور مقاصدِ عالیہ کو یکجا کر دیا۔ سیر و سیاحت ہر انسان کرتا ہے، ہر انسان کو دنیا کی سیر کرنے کا شوق ہوتا ہے، سیاحت کرنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے اس کو سنتِ الٰہی پر غور و خوض کا ذریعہ بنایا ہے۔ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ فلاں چیز کو دیکھو، فلاں چیز کو دیکھو، آسمان کیسے پیدا کیا گیا، پہاڑ کیسے کھڑے کئے گئے، صحرا کیسے بنائے گئے۔ یہ چیزیں انسان دن رات دیکھتا ہی ہے، لیکن اگر ان معاملات کو حقائقِ کائنات پر اسلام کے رویے اور موقف سے ہم آہنگ کر دیا جائے تو خالص تفریح اور اسلام کے مقاصدِ عالیہ، خالص تفریح اور روحانیت یکجا ہو جاتے ہیں، اور تفریح کے مقاصد پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خالص

تفریح کے ذریعے روحانی مقاصد خود بخود حاصل ہوتے جاتے ہیں۔

رسول ﷺ کے مبارک دور میں جب سادہ سا ماحول تھا، زندگی کی ضروریات سادہ تھیں تو تفریح کے جو طریقے استعمال کئے جاتے تھے وہ اس نوعیت کے تھے کہ ان میں روحانی مقاصد کی تکمیل بھی آپ سے آپ ہو جاتی تھی۔ تیر اندازی کا مقابلہ، گھڑ سواری، دوڑ، کشتی، یہ وہ سرگرمیاں ہیں جو نوجوانوں کی جسمانی صحت اور تن سازی میں بھی کارآمد ہوتی ہیں۔ ان کو اسلامی تہذیب کی تعمیر اور اسلامی ریاست کے دفاع میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں شریعت نے تفریح کے احکام بتائے ہیں اور تفریح کی حدود کو بیان کیا ہے، وہاں تین باتیں بنیادی طور پر یاد دلائی ہیں۔ ایک یہ کہ جب بھی تفریح کی جائے وہ اس نوعیت کی ہو کہ اس سے مقاصد حیات فراموش نہ ہوں۔ حیاء کے تقاضے مجروح نہ ہوں اور تبذیر اور اسراف سے اجتناب کیا جائے۔ تفریح کے باب میں عموماً مقامی تقاضوں کا بہت دخل ہوتا ہے۔ مقامی ثقافتیں، علاقائی رواج کا بہت گہرا تعلق تفریحات سے ہوتا ہے۔ اگر مقامی تفریحات اور رواجات میں کوئی چیز شریعت کے واضح احکام کے خلاف نہ ہو اور ملت مسلمہ کی وحدت کو متاثر کرنے والی کوئی بات نہ ہو، تو یہ سب تفریحات اسلامی تہذیب کا حصہ ہیں۔

علم اور فن کے علاوہ دوسری اہم اور بنیادی بات جس پر امت اسلامیہ کے تہذیبی مستقبل کا دارومدار ہے وہ عدل ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا بلکہ کئی بار عرض کیا ہے کہ علم اور عدل یہ دو اہم بنیادیں ہیں جن پر اسلامی تہذیب اور شریعت کا دارومدار ہے۔ شریعت نے عدل کی بہت سی قسمیں بیان کی ہیں۔ قانونی یا عدالتی اور حقیقی عدل کو پہلی مرتبہ الگ الگ بیان کیا ہے۔ عدل اجتماعی کا ذکر کیا ہے۔ عدل اجتماعی کے بارے میں بہت سے احکام دیے ہیں۔ تقسیم دولت کا نظام جو عدل اجتماعی کا لازمی تقاضا اور ذریعہ ہے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ معاشی تخلیق کے راستے میں جو تعطلات ہیں ان کو ایک ایک کر کے دور کیا ہے۔ جو لوگ بے وسیلہ ہیں ان کو وسائل فراہم کرنے پر توجہ دی ہے۔ ہر انسان اور ہر شہری کی عام اس سے کہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، بنیادی ضروریات پوری کرنے کا حکم دیا ہے۔

کفاف کی اصطلاح اسلامی فقہی ادب میں استعمال ہوتی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ کم سے کم ضروریات جو انسان کو کسی علاقے میں درکار ہوں۔ بنیادی ضروریات کے باب میں جو

بھی ناگزیر ضرورت پیدا ہو اس کا پورا کرنا ریاست اور معاشرہ دونوں کی ذمہ داری ہے۔ کفاف کا تعین ہر علاقے اور ہر زمانے کے لحاظ سے الگ الگ کیا جائے گا۔ آج سے چودہ سو سال قبل کے عرب ریگستان اور صحراؤں میں کفاف کا جو مفہوم تھا وہ آج کے کسی بڑے متمدن شہر میں کفاف کے مفہوم سے مختلف ہو سکتا ہے۔ اور مختلف ہوتا ہے۔ کفاف فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داری بھی ہے اور معاشرے کی ذمہ داری بھی ہے۔ اگر ریاست کے وسائل کافی نہیں ہیں یا ریاست کوتاہی کر رہی ہے تو پھر معاشرہ اس کا ذمہ دار ہے۔ پھر معاشرے میں جس کے پاس جتنے وسائل ہیں وہ ان وسائل کے اعتبار سے عامۃ الناس کی ضروریات کو پورا کرنے کا پابند ہے۔ بڑے بڑے ائمہ اسلام امام الحرمین، امام غزالی، علامہ ابن حزم، اور بہت سے دوسرے حضرات نے ان ضروریات کی تکمیل کے لئے شریعت کے احکام پر غور کر کے تفصیلی قواعد وضوابط بیان کئے ہیں۔

یہ بات اسلامی تہذیب کی اہم امتیازی خصوصیت رہی ہے کہ علم اور عدل دونوں ریاست اور حکمرانوں کے اثر ورسوخ سے آزاد رہے ہیں۔ حکمرانوں اور بادشاہوں کا دباؤ نہ علم پر رہا ہے نہ عدل پر رہا ہے۔ علم تو بالکل آزاد رہا ہے اور اس علم میں سب سے زیادہ علم شریعت اور علم فقہ شامل ہے۔ علم کی آزادی کے معنی قانون کی آزادی کے بھی ہیں۔ اسلام کی تاریخ میں ایک طویل عرصے تک بارہ سو سال تک قانون اور فقہ، فتویٰ اور شریعت، اجتہاد اور اجماع، یہ سب ادارے حکمرانوں کے اثر ورسوخ سے آزاد رہے ہیں۔ یہ پہلی بار مغربی تہذیب نے کیا ہے کہ دنیائے اسلام میں قانون سازی پر ریاست کا قبضہ ہو گیا۔ حکمرانوں اور حکمرانوں کے کاسہ لیسوں نے قانون بنانے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسلامی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اسلامی تاریخ میں مجتہد آزادانہ اجتہاد کیا کرتا تھا۔ فقیہ آزادانہ تفقہ سے کام لیا کرتا تھا، مفتی ریاست کے فتویٰ کا پابند نہیں تھا۔ شریعت کے احکام کا پابند تھا۔

یہی کیفیت بڑی حد تک عدل کے بارے میں رہی ہے۔ عدل کے دو پہلو ہیں، ایک پہلو تو یہ ہے کہ عامۃ الناس کو، بالخصوص کسی مخاصمت کے فریقین کو یہ معلوم ہو جائے کہ قانون شریعت میں ان کا حق کیا بنتا ہے۔ یہ کام مفتی کا ہے اور مفتی ریاست سے الگ ہو کر براہ راست قرآن وسنت پر غور کر کے اور ائمہ اسلام کے اجتہادات کی روشنی میں یہ بتائے گا کہ متعلقہ

فریقین کے حقوق کیا کیا ہیں؟ ذمہ داریاں کیا کیا ہیں؟ یہاں کسی ریاست کا کوئی کردار نہیں ہے۔ آج بھی جن معاملات میں اہل افتاء فتویٰ دیتے ہیں اور جن معاملات میں اہل افتاء سے فتویٰ لیا جاتا ہے، وہ اپنے فتاویٰ میں کسی بادشاہ کے حکم یا کسی قانون ساز ادارے کے فیصلے یا کسی پارلیمنٹ کی قرارداد کے نہیں، وہ شریعت کے پابند ہوتے ہیں۔ مفتی قرآن کریم اور سنت کو دیکھ کر فیصلہ کرتا ہے۔ ائمہ اسلام کے اجتہادات کی روشنی میں فتویٰ دیتا ہے۔

عدل کا دوسرا پہلو تھا عملاً فریقین کے درمیان فیصلہ کرنا۔ یہ کام قاضی کیا کرتے تھے۔ قاضی کی آزادی اسلامی ریاست میں مختلف انداز میں یقینی بنانے کی کوششیں کی گئی ہے۔ اس کا ایک مظہر وقف کا ادارہ بھی تھا۔ وقف کے ادارے کے نتیجے میں قاضیوں کے مالی اور مادی مفادات وضروریات حکومتوں کے کنٹرول سے آزاد ہوا کرتی تھیں۔ وقف عدالتوں کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔ قاضی وقف سے اپنی ضروریات پوری کرتا تھا۔ وہی وقف کا منتظم بھی ہوتا تھا۔ عدالتیں اور عدالتی ادارے مل کر وقف کے نظام کو چلاتے تھے۔ عدالتوں کی یہ ذمہ داری بھی ہوتی تھی اور اسلامی تاریخ میں قاضی صاحبان ہر دور میں یہ کام کرتے رہے ہیں کہ وہ منصب قضا کے ساتھ ساتھ فقہ اور شریعت کی تعلیم کا انتظام بھی کیا کرتے تھے۔ تمام قاضی صاحبان، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے زمانے سے لے کر اور ماضی قریب تک جہاں قضاء کی ذمہ داریاں انجام دیا کرتے تھے۔ وہاں عامۃ الناس کی دینی اور فقہی تعلیم وتربیت کا فریضہ بھی انجام دیا کرتے تھے۔ اپنے شاگردوں کو قضاء اور فقہ کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے۔

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جن کے بارے میں یہ مشہور ارشاد ہم سب نے بار بار سنا ہے **واقضاهم علی** مسلمانوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے، مسلمانوں قاضیوں میں سب سے بڑے قاضی علی بن ابی طالب ہیں۔ علی بن ابی طالب جہاں قضاء کی ذمہ داریاں انجام دے رہے تھے، جہاں خلافت کی نازک ذمہ داریاں انجام دے رہے تھے وہاں وہ اپنے شاگردوں کی تربیت بھی فرما رہے تھے۔ کوفہ کے بڑے بڑے فقہاء سیدنا علیؓ کے شاگرد ہیں یا عبداللہ ابن مسعودؓ کے شاگرد ہیں۔ یہ دونوں حضرات کوفے کے بڑے قاضیوں میں شمار ہوتے ہیں۔

اس سے یہ پتا چلتا ہے اور اسلامی تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قاضی نے اپنے

جانشین کو خود تربیت دے کر تیار کیا۔ قاضیوں کا تقرر عموماً پوری زندگی کے لیے ہوتا تھا۔ یعنی اس کو لائف ٹینیور دیا جاتا تھا الا یہ کہ کسی اعتراض یا کسی الزام کی بنیاد پر اس کو پہلے موقوف کر دیا جائے۔

قاضی اپنی ضروریات اور مادی تقاضے وقف سے پورے کیا کرتا تھا جو اسی کے زیر نگرانی کام کیا کرتا تھا۔ قاضی اپنی زندگی میں اپنے جانشین حسب ضرورت خود ہی تیار کرتا تھا۔ ان جانشینوں میں جو سینئر ترین جانشین ہوتا تھا، اپنے علم، اخلاق، کردار اور تقویٰ کے لحاظ سے، وہ قاضی کا جانشین مقرر کر دیا جاتا تھا۔ بنی امیہ اور بنو عباس کے زمانے تک یہ صورتحال جاری رہی کہ جس بستی کا قاضی مقرر کیا جاتا تھا اس بستی کے ذمہ دار لوگوں سے بلا کر یہ پوچھا جاتا تھا کہ آپ کے یہاں کونسی دینی شخصیت ایسی ہے جو تقوی، علم، اخلاق و کردار کے اعتبار سے اتنی نمایاں ہے کہ اس کو قاضی مقرر کر دیا جائے۔ عام طور پر سابقہ قاضی ہی کے جید ترین شاگرد اور تلمیذ رشید کو قاضی مقرر کر دیا جاتا تھا۔ اس طریقہ کار نے عدل کی آزادی کو برقرار رکھا۔

فقہائے کرام نے وقف کے قواعد بھی مقرر کیے، علم وعدل کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے قواعد وضوابط مقرر کیے اور اس بات کو یقینی بنایا کہ اسلام کی ان دو اہم ترین بنیادوں کو وقتی سیاست، وقتی مصلحتوں کو اور بااثر لوگوں کے وقتی رجحانات کے اثرات سے حتی الامکان محفوظ رکھا جائے۔ آج اگر علم اور عدل کی آزادی کو برقرار رکھنا ہے تو جہاں یہ نمونے ہمارے سامنے ہیں وہاں دور جدید کے بعض نمونے بھی سامنے ہیں۔ یہ ہمارے ارباب حل وعقد کا اور اہل علم کا فریضہ ہے کہ وہ ان دونوں تجربات کو، ماضی کے تجربات کو اور دور جدید کے معاصر تجربات کو سامنے رکھ کر ایک ایسا طریق کار اور قابل عمل نظام بنائیں جو علم اور عدل دونوں کی آزادی کو یقینی بنا سکے۔

آج ہوتا یہ ہے، میں پاکستان کی مثال پر اکتفا کرتا ہوں، کہ ہر کس وناکس جو اٹھتا ہے چاہے اس کو اسلام کی الف ب کا پتا نہ ہو، ہمارے ایک بزرگ استاد کے بقول جو ماں کے نام خط تک لکھنا نہ جانتا ہو، وہ سب سے پہلے تعلیم اور علم میں مداخلت شروع کرتا ہے۔ ہر آنے والا کم فہم اسلامی جمہوریہ پاکستان کے لیے تعلیمی پالیسی بنانا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ ایسے لوگ جنہوں نے کبھی کسی درسگاہ میں حصول تعلیم کے بعد قدم نہ رکھا ہو جن کی پوری زندگی تعلیم پر غور و

خوض سے خالی رہی ہو، جنہوں نے پاکستان کی تاریخ تعلیم کے بارے میں ایک مضمون بھی نہ پڑھا ہو۔ وہ تعلیم کے بڑے ماہر بن جاتے ہیں۔ جو نتیجہ ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔

یہی معاملہ عدل کے بارے میں ہوتا ہے کہ ہر آنے والا حکمران پورے نظام عدل وقضاء کو اپنے اقتدار کے تابع رکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے ان دونوں بنیادوں کا تحفظ، ارتقاء اور تسلسل، یہ امت مسلمہ کے مستقبل کی منظر کشی کے لیے ناگزیر ہے۔ اسلامی شریعت کا مستقبل اور اسلامی تہذیب کا مستقبل دونوں کا دارومدار مسلمانوں کے اس رویے پر ہے، عامۃ الناس کی اس تربیت پر ہے جو علم اور عدل کے بارہ میں ان کو دی جائے گی۔ یہ تربیت امت مسلمہ کے اس مطلوبہ مستقبل کو یقینی بنانے کے لیے ناگزیر ہے۔

اسلامی شریعت کے پیغام میں جو تصورات اور عوامل بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ان سب کو سامنے رکھے بغیر مستقبل کی نقشہ کشی آسان کام نہیں ہے۔ مقاصد شریعت یعنی پانچ بنیادی اہداف کو سامنے رکھنے کے ساتھ ساتھ جن تصورات اور اصولوں کو سامنے رکھنا چاہیے، جو شریعت کے تمام احکام کے بنیادی عوامل اور محرکات کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں سے بعض کا ذکر میں کرنا چاہتا ہوں۔

شریعت نے بارہا اپنے کو ہدایت قرار دیا ہے۔ ھدی للناس، ھدی للمتقین یہ ہدایت اور رہنمائی زندگی کے سارے گوشوں کے لیے ہے، جیسا کہ اس سے پہلے گیارہ گزارشات میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ یہ ہدایت اور راہنمائی جب تک زندگی کے سارے پہلوؤں میں جلوہ گر نہیں ہوگی اس وقت تک اسلام کا تہذیبی مستقبل اوجھل رہے گا۔ یہ ہدایت معیشت کے لیے بھی ہے، معاشرت کے لیے بھی ہے، قانون کے لیے بھی ہے۔ عدل اور تعلیم کے لئے بھی ہے، خاندانی معاملات کے لیے بھی ہے، فرد کی تربیت کے لیے بھی ہے، بین الاقوامی معاملات اور رہنمائیوں کے لیے بھی ہے۔

شریعت نے اپنے کو رحمت قرار دیا ہے۔ کوئی ایسا قانون، کوئی ایسا نظام، کوئی ایسا تصور جو رحمت کے اس تصور کے خلاف ہو، جس میں رحمۃ للعالمین کے پیغام رحمت کا یہ تصور نہ جھلکتا ہو، وہ اسلام سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ آج مسلم ممالک میں کتنے نظام ہیں، ملازمتوں کے، غیر مسلموں سے ڈیل کرنے کے، غیر ملکیوں سے معاملہ کرنے کے جن میں رحمت کا یہ تصور موجود

نہیں ہے۔ رحمت کا یہ تصور عدل کے باب کا پہلا درجہ ہے۔ عدل تو لازمی ہے ہی، عدل تو بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور عدل کے بارے میں کہہ چکا ہوں کہ ایک سطح تو وہ ہے جو ریاست کی ذمہ داری ہے، جو عدل قانونی یا عدل قضائی ہے۔ دوسری سطح وہ ہے جو افراد کی ذمہ داری ہے، عامۃ الناس کی ذمہ داری ہے، وہ عدل حقیقی ہے اور عدل حقیقی کے بعد احسان اور رحمت کے درجات آتے ہیں۔ اسلامی ریاست کا مزاج یہ ہونا چاہیے کہ عدل کے لازمی اور قانونی تقاضے تو ہر صورت میں پورے ہوں۔ اس کے بعد ریاست کی پالیسیوں میں ریاست کے رویوں میں، ریاست کے کارپردازوں کے مزاج میں، احسان اور رحمت کے تصورات جھلکتے ہوں۔ مثال کے طور پر بین الاقوامی معاملات میں دنیا کی مظلوم اقوام کی تائید، دنیا کے محروم انسانوں کی مدد، خاص طور پر محروم اور مظلوم مسلمانوں کی مدد ریاست کی پالیسی ہونی چاہیے۔ بالادست غیر مسلم طاقتوں کے ساتھ مل کر کمزور اور نہتے مسلمان عوام کا قتل عام کرنا کسی بھی اعتبار سے اسلامی شریعت سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ یہ اسلامی شریعت سے بغاوت تو کہا جا سکتا ہے، اسلامی شریعت پر عملدرآمد کے تقاضوں سے یہ رویہ کوسوں دور ہے۔

اسلامی قانون کا مزاج آسانی کا ہے۔ عامۃ الناس کے لیے قانون کے ذریعے آسانیاں پیدا کرنا، پالیسیوں کے ذریعے آسانیاں پیدا کرنا، ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اگر ریاست عامۃ الناس کے لیے مسلمانوں اور غیر مسلموں سب کے لیے آسانیاں پیدا نہیں کر رہی ہے، مشکلات پیدا کر رہی ہے، غیر ضروری طور پر قواعد وضوابط کا بوجھ ان پر ڈال رہی ہے تو وہ اسلام کے مزاج کے خلاف کام کر رہی ہے۔ شریعت نے محض آسانی پیدا کرنے کا حکم نہیں دیا، رسول اللہؐ نے محض آسانی پیدا کرنے کی ہدایت نہیں فرمائی بلکہ مشکلات کو دور کرنے کی ہدایت بھی فرمائی ہے۔ جہاں قرآن کریم یسر اور آسانی فراہم کرتا ہے وہاں مشکل کو دور کرنے کا بھی ذکر کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب کسی ذمہ داری پر کسی صحابی کو فائز فرماتے تھے تو یہ ہدایت دیا کرتے تھے کہ **یسروا ولا تعسروا** جب آپ نے دو صحابہ کو ایک ذمہ داری پر بھیجا اور ان دونوں کو ایک ساتھ ہدایت دی تو آپ نے فرمایا کہ **یسرا ولا تعسرا** میری امت کے لیے آسانیاں پیدا کرنا، مشکلات پیدا مت کرنا۔

اس کے لیے جو اصطلاح قرآن حکیم نے استعمال کی ہے وہ رفع حرج ہے۔ **وما جعل**

علیکم فی الدین من حرج شریعت نے دین میں کوئی حرج نہیں پیدا کیا۔ لہذا ہر وہ قانون، ہر وہ نظام، ہر وہ قاعدہ یا ضابطہ جس سے غیر ضروری طور پر مشکل پیدا ہو، عامۃ الناس کے لیے دقت ہو وہ شریعت کے احکام سے متعارض ہے۔

شریعت نے ضرر کو دور کرنے کا حکم دیا ہے۔ ضرر یعنی نقصان یا damage اور inconvenience یہ سب کے سب ضرر میں شامل ہیں۔ جس چیز کو انگریزی قانون میں damage کہا جاتا ہے، inconvenience کہا جاتا ہے، hardship کہا جاتا ہے۔ یہ سب ضرر کی مختلف قسمیں اور شکلیں ہیں، جن میں سے بعض کو حرج بھی کہا جائے گا، بعض کو عسر کہا جائے گا، لیکن ضرر کی اصطلاح ان سب کے لیے عام ہے۔ فقہ اسلامی کا اصول ہے **الضرر یزال** ضرر کو ختم کیا جائے گا، مٹایا جائے گا۔ ایک مشہور حدیث نبوی میں ارشاد ہے **لا ضرر ولا ضرار** نہ ضرر پہنچاؤ اور نہ ضرر کا مقابلہ ضرر سے کرو۔

شریعت نے تمام انسانوں حتی کہ جانوروں اور دوسری مخلوقات کے حقوق کا لحاظ کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ حقوق محض زندہ انسانوں کے نہیں ہیں۔ مردہ انسانوں کے بھی ہیں، جانوروں کے بھی ہیں، نباتات اور جمادات کے بھی ہیں، دریاؤں اور پہاڑوں کے بھی ہیں، میدانوں اور صحراؤں کے بھی ہیں۔ ہر چیز کا شریعت نے حق رکھا ہے۔ ہر چیز کا استعمال شریعت کی حدود کے مطابق کیا جائے گا تو اس کے حقوق کی نگہداشت ہو سکے گی۔ عدل و انصاف انسانیت اور شریعت کی حدود سے باہر نکل کر جب کسی چیز کو برتا اور استعمال کیا جائے گا تو وہ اس کے حقوق کی خلاف ورزی کے مترادف ہوگا۔

شریعت نے امانتوں کے ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ "**ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا**" اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ تمام امانتیں ان کے حقداروں کو اور ان کے مالکان کو پہنچا دو۔ مفسرین قرآن نے امانت کی اس تفسیر میں جو بحثیں کی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ امانت میں زندگی کا ہر پہلو شامل ہے۔ سرکاری مناصب اور ذمہ داریاں بھی امانت ہیں۔ مشورہ بھی ایک امانت ہے، رائے بھی ایک امانت ہے، علم بھی ایک امانت ہے، آپ کے پاس کوئی مہارت یا تخصص ہے تو وہ بھی امانت ہے، نعمت بھی امانت ہے، مال و دولت بھی ایک امانت ہے، آپ اپنی تمام متملکات اور مال و دولت کے امین ہیں۔ وہ مال و دولت جس کے

آپ مالک سمجھے جاتے ہیں، دراصل آپ اس کے مالک نہیں ہیں، بلکہ امین ہیں۔ ان سب چیزوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے امین ہیں۔ گویا زندگی ساری کی ساری امانت سے عبارت ہے اور زندگی کی ہر سرگرمی ادائے امانت پر مبنی ہونی چاہیے۔

سچائی کا احترام اسلام کی بنیادی صفت ہے۔ امانت اور صداقت یہی رسول اللہ ﷺ کے دو بنیادی اوصاف تھے، جن سے آپ نبوت سے پہلے سے معروف تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کو جن صحابہ نے بغیر کسی چون و چرا کے قبول کیا، بغیر کسی تامل اور دلیل کے مانا ان کے ایمان کی بنیاد رسول اللہ کی امانت وصداقت تھی۔ خدیجۃ الکبریٰ نے یہ بات سنتے ہی بلا تامل جب یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو رسوا نہیں کرے گا تو اس لیے کہ انہوں نے پچیس سال مسلسل آپ کی امانت وصداقت کا مشاہدہ کیا تھا۔ قریب سے دیکھا تھا، دن رات دیکھا تھا، تجارت و کاروبار کے رفیق کے طور پر دیکھا تھا، اپنے شوہر کے طور پر دیکھا تھا، پڑوسی کے طور پر دیکھا، شہری کے طور پر دیکھا، مکہ کے ایک نوجوان باکردار تاجر کے طور پر دیکھا۔ صدیق اکبر نے جب بغیر کسی تامل کے سنتے ہی پیغام نبوت کو قبول کیا تو ۳۸ سالہ رفاقت کے دوران جس صداقت و امانت کا مشاہدہ کیا تھا اس کی بنیاد پر کیا۔ لہٰذا امانت وصداقت اسلامی تہذیب، اسلامی شریعت اور اسلامی زندگی کی بنیادوں میں شامل ہیں۔

قول کی پابندی، وفائے عہد، اسلام میں معاملات کی عمارت کا سب سے بنیادی پتھر ہے۔ دو انسانوں کے درمیان معاملات ہوں، دو گروہوں کے اور دو قوموں کے درمیان ہوں، اللہ اور بندے کے درمیان ہوں، ان سب میں قول کی پابندی اور عہد کو نبھانا اسلامی تہذیب کا طرۂ امتیاز رہا۔ اس کے جو نمونے اسلامی تاریخ نے پیش کئے ہیں وہ دنیا کی کوئی اور قوم پیش نہیں کر سکتی۔ گفتگو طویل ہو رہی ہے۔ اس کا موقع نہیں کہ ان واقعات کی مثالیں پیش کی جائیں۔ لیکن مسلموں اور غیر مسلموں دونوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔

علم و عدل کے ساتھ یہ وہ محرکات یا بنیادیں ہیں، اساسات ہیں جن کی بنیاد پر مستقبل کی اسلامی تہذیب کو تعمیر ہونا ہے۔ جن کی بنیاد پر شریعت کی روشنی میں اسلامی تمدن اور اسلامی زندگی کی تشکیل ہونی ہے۔ اسلامی زندگی کی یہ تشکیل، اسلامی تہذیب کا یہ فروغ، اسلامی قوانین

اور طرز زندگی کی یہ تشکیل جہاں ایک طرف ماضی کے تسلسل کی ضامن ہوگی وہاں مستقبل کے تمام اعتبارات، تحدیات، challenges اور مسائل کا جواب بھی ہوگی۔

اسلامی تہذیب اور اسلامی شریعت کو ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی شریعت ایک تسلسل ہے، اسلامی تہذیب ایک تسلسل سے عبارت ہے۔ اسلامی تہذیب کی تشکیل میں ماضی کے تمام علمی اور فکری ذخیرے سے گہرا تعلق اور وابستگی ناگزیر ہے۔ اسلامی شریعت میں تو فقہ کی تعریف ہی یہ ہے کہ شریعت کے ان احکام کا علم جو قرآن وسنت کے تفصیلی دلائل سے ماخوذ ہیں، لہٰذا قرآن وسنت سے براہِ راست، مسلسل اور ناقابل شکست وابستگی تو اس عمل کا بنیادی اور ناگزیر حصہ ہے۔ قرآن وسنت سے وابستگی کسی خلا میں نہیں ہوگی۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں یا کم از کم ان کے طرز عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاید قرآن آج نازل ہوا ہے، سنت کا علم آج ان کو ہوا ہے اور وہ اپنی کم علمی اور سادہ لوحی سے یہ سمجھتے ہیں کہ آج اگر انہیں کسی حدیث کا علم ہوگیا ہے، یا قرآن کی کسی آیت کا علم ہوگیا ہے تو ایسا اسلام کی تاریخ میں پہلی بار ہوا ہے، نہ ماضی میں کسی نے قرآن اور حدیث کو سمجھا، نہ ماضی قریب میں کسی نے سمجھا۔ آج پہلی بار انہی کی سمجھ میں آیا ہے کہ قرآن کریم یا سنت کیا کہتے ہیں۔ اس طرز عمل سے فائدہ تو شاید ہی ہوتا ہو قباحتیں بہت پیدا ہوتی ہیں، اسلامی روایت کے تسلسل میں خلل پڑتا ہے۔ اسلامی روایت کا تسلسل برقرار رکھنا اسلامی تہذیب کے لیے ناگزیر ہے۔

یہاں تقلید کا سوال بھی آجاتا ہے جو ایک دودھاری تلوار ہے۔ تقلید بعض پہلوؤں میں، بعض اعتبارات سے ناگزیر ہے۔ جہاں تقلید کے بغیر چارہ نہیں۔ مثلاً میں سائنس کا علم نہیں رکھتا، میں فزکس سے واقف نہیں ہوں۔ اس لیے اگر کوئی ایسا معاملہ ہو جس کا تعلق سائنس سے ہو اور مجھے اس کے بارہ میں کوئی فیصلہ کرنا پڑے تو میں بغیر کسی دلیل کے محض اعتماد کی بنیاد پر کسی ایسے سائنس دان کی رائے کی پابندی کروں گا جس کے علم اور کردار پر مجھے اعتماد ہو۔ اگر میں معاشیات کا ماہر نہیں ہوں اور مجھے کوئی معاشی فیصلہ کرنا ہے تو میں ایسے ماہر معیشت کی رائے پر فیصلہ کروں گا جس کے علم اور مہارت پر مجھے اعتماد ہو، جس کے کردار پر مجھے بھروسہ ہو، یہی تقلید ہے۔

تقلید صحابہ کرام کے زمانے سے جاری ہے، صحابہ کرام جن کی تعداد کم سے کم ایک لاکھ

چوبیس ہزار تھی ان میں اہل فتوئ اور اہل اجتہاد کی تعداد ایک سو بیس، ایک سو پچاس سے زیادہ نہیں تھی، بقیہ صحابہ کرام انہی کے مشورے سے انہی کی رہنمائی سے، انہی سے پوچھ کر شریعت پر عمل کیا کرتے تھے۔ اور ان کے علم اور تقویٰ پر اعتماد کی بنیاد پر ان کے اجتہادات کو قبول کرتے تھے اور کوئی دلیل طلب نہیں کرتے تھے۔ یہی کیفیت تابعین کے زمانے میں بھی رہی، ائمہ محدثین، مجتہدین فقہاء دنیائے اسلام میں کتنے تھے؟ امام بخاری کی سطح کے انسان کتنے تھے؟ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کی سطح کے انسان کتنے تھے؟ امام احمد بن حنبل کے درجے کے انسان کتنے تھے؟ چند سو یا چند ہزار تھے جن کی بقیہ لاکھوں مسلمان تقلید پہلے بھی کر رہے تھے۔ اب بھی کر رہے ہیں۔ لہذا اگر کوئی شخص علم نہیں رکھتا تو اس کے لیے اصحاب علم کی پیروی اور تقلید ناگزیر ہے۔

لیکن یہ تقلید کی ایک سطح ہے، اس کا تعلق انسانوں کی روزمرہ زندگی سے ہے، اس کا تعلق انسانی معاشرے کی اسلامی اساس اور اس کے تسلسل سے ہے۔ لیکن مستقبل کی تشکیل، مستقبل کی نقشہ کشی، ماضی کے تسلسل کی ضمانت کے ساتھ ساتھ جس چیز کا تقاضا کرتی ہے وہ نئے چیلنجز کا سامنا کرنا ہے، نئے مسائل کو حل کرنا ہے، نئی مشکلات کو دور کرنا ہے، نئے سوالات کا جواب دینا ہے۔ ان سب امور کے لیے نئے مسائل کے حل کے لیے جرأت مندانہ اجتہاد ناگزیر ہے۔ لہذا ماضی سے تسلسل برقرار رکھنے کے لیے تقلید اور مستقبل کی نقشہ کشی کے لیے اجتہاد ایک اساسی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک ایسا توازن ہونا چاہیے کہ نہ تقلید کے تقاضے مجروح ہوں جس کے نتیجے مین تسلسل کا عمل اختلال کا شکار ہو جائے اور نہ اجتہاد کے تقاضے مجروح ہو جس کے نتیجے میں مستقل کی نقشہ کشی مشکل ہو جائے۔

مستقبل کی نقشہ کشی جب بھی کی جائے گی، آئندہ کی عمومی منظر کشی جب بھی کی جائے گی تو وہ ہمہ پہلو اور ہمہ گیر تبدیلی کی متقاضی ہوگی، اس تبدیلی کے نتیجے میں فرد کی تربیت بھی ہو گی، فرد کی اخلاقی تشکیل بھی ہوگی، فرد کی تعلیمی اور فکری تہذیب بھی ہوگی، خاندان کا ادارہ بھی مضبوط بنایا جائے گا، ان تمام قوتوں کو فروغ دیا جائے گا جو خاندان کے ادارے کو برقرار رکھنے میں مدد معاون ہوں گے۔ ان تمام محرکات کا سدباب کیا جائے گا جو خاندان کے دائرے کو کمزور کرنے کا باعث ہوں۔ خاندان کے ادارے کو مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کو

اسلامی خطوط پر استوار کرنا پڑے گا۔ معاشرے کی اخلاقی بنیادوں کو محفوظ کرنا پڑے گا۔ معاشرے کی اخلاقی بنیادوں کے تحفظ کے لیے وہ تمام تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی جن تدابیر کا شریعت نے حکم دیا ہے۔ ان تدابیر کے لیے نئے نئے ادارے بھی بنائے جائیں، ماضی کے اداروں کا احیاء بھی کیا جائے، دونوں سے کام لے کر اور دونوں کو ملا کر نئے ادارے اور نئے قوانین اور ضابطے بنائے جائیں گے۔ یہ کام ایک نئی اجتہادی بصیرت کا تقاضا کرتا ہے۔ شریعت نے نہ ماضی کے کسی ادارے یا تجربے کو جوں کا توں اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، نہ غیر ضروری طور پر کسی نئے ادارے کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ شریعت کا اصل زور مقاصد اور اہداف پر ہے اور نصوص کی تعمیل پر ہے۔

شریعت کے احکام پر جوں کا توں عملدرآمد اور جہاں منصوص احکام نہیں ہیں وہاں مقاصد شریعت کی تکمیل، ان دو ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لیے جہاں جہاں اداروں کی ضرورت ہو، جہاں جہاں تدابیر کو اختیار کرنے کی ضرورت ہو، وہاں ادارے بھی بنائے جائیں گے۔ تدابیر بھی اختیار کی جائیں گی، پالیسیاں بھی بنائی جائیں گی، قواعد وضوابط بھی بنائے جائیں گے۔ ان سب کاموں کے کرنے میں ماضی کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا جائے گا۔ موجودہ تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا جائے گا۔ اور مستقبل کے اندازوں کو بھی پیش نظر رکھا جائے گا۔

ماضی یا حال کے ان تجربات اور اداروں سے فائدہ اٹھانے میں مسلم اور غیر مسلم، مشرق یا مغرب، ملحد یا غیر ملحد کی کوئی تقسیم نہیں ہے۔ اگر کسی ملحد قوم میں عدل وانصاف کے لئے کوئی ادارہ وجود میں آیا ہے اور موثر طور پر کام کر رہا ہے اور اس ادارے میں کوئی بات شریعت کے منصوص احکام سے متعارض نہیں ہے اور اس سے شریعت کے مقاصد کی تکمیل ہوسکتی ہے تو اس کو اختیار کرنا شریعت کا منشا ہے، وہ مسلمان کی گمشدہ پونجی ہے جس کو اپنانا چاہیے۔

اسلامی معاشرے میں مسجد کا کردار بنیادی اہمیت رکھتا ہے، مسجدیں اسلامی معاشرے کی اساس ہیں۔ مسجدیں مسلم معاشرے کی وہ طنابیں ہیں جو اس کو قائم رکھتی ہیں، جن کیلوں سے طنابیں باندھی جاتی ہیں، مسجدوں کی حیثیت ان کیلوں کی ہے جو جا بجا موجود ہونی چاہیں۔ مسجدوں کے ذریعے دین کی تعلیم وتربیت کا کام ہونا چاہیے۔ مسلم معاشرے کا معاشرتی مرکز

مسجدوں کو ہونا چاہیے۔ اسلامی معاشرہ میں مرکز اعصاب مسجدیں ہوں، مسلمانوں کا ہر کام مسجد سے وابستہ ہونا چاہیے۔ مسجد کے اہل علم کا تعلق معاشرے کے اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ طبقے سے ہونا چاہیے۔ ان کی حیثیت محلے کے وظیفہ خور کی نہ ہو، محلے کے قائد اور اخلاقی اور روحانی معاملات میں محلے کے پیشوا کی ہو۔

اسلامی ریاست میں معیشت اور سیاست کا کردار بنیادی ہے۔ معیشت وسیاست ہر دور میں نئے نئے انداز میں تشکیل پاتی رہی ہیں۔ امت مسلمہ نے ہر دور میں اپنی معیشت کو نئے انداز سے مرتب کیا ہے۔ سیاست کے ادارے نئے نئے انداز سے سامنے آتے رہے ہیں۔ شریعت نے معیشت وسیاست کے باب میں تفصیلی احکام نہیں دیے۔ تفصیلی احکام سے مراد یہ ہے کہ جزئیات سے متعلق ہدایات نہیں دیں۔ کلیات بیان فرمائے ہیں۔ عمومی احکام دیے ہیں۔ اس لیے کہ یہ وہ معاملات ہیں جن کا تعلق ریاست اور معاشرے کے ارتقاء اور تہذیبی ترقی سے ہوتا ہے۔ ارتقاء اور تہذیبی ترقی کے تقاضوں کے لحاظ سے شریعت کے احکام پر عملدرآمد کی اداراتی یعنی institutional اور عملی شکلیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ اس لیے جہاں تک عملی تفصیلات کا تعلق ہے شریعت نے معیشت اور سیاست کے باب میں وہ تفصیلات بیان نہیں کیں۔

معیشت کے باب میں مثال کے طور پر شریعت نے یہ کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ دولت کا ارتکاز نہیں ہونا چاہیے۔ دولت خون کی طرح ہے اس کو معاشرے کے ہر طبقے میں پھیلنا چاہیے۔ اس ارتکاز کو ختم کرنے کے لیے کیا کیا تدابیر کی جائیں؟ ان میں سے کچھ تدابیر تو وہ ہیں جو منصوص احکام کے ذریعے آئی ہیں، ان منصوص احکام پر عمل کیا جائے گا۔ لیکن جہاں منصوص احکام نہیں ہیں ان معاملات میں شریعت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے نئے اداروں کی ضرورت پڑسکتی، نئے قواعد وضوابط کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ اگر نئے قواعد و ضوابط کسی مشرقی یا مغربی ملک میں بنائے گئے ہیں اور اہل حل وعقد کا، ارباب بصیرت کا اور مجتہدانہ بصیرت رکھنے والے اہل دانش کا یہ احساس ہو کہ ان تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیے تو ان سے فائدہ اٹھانا شریعت کے عین مطابق ہے۔

اسلام کے تہذیبی مستقبل کا دارومدار بہت بڑی حد تک جن معاملات پر ہے وہ قانون

اسلامی کی نئی تعبیر اور فقہ واصول فقہ کی نئی تشکیل کا عمل ہے۔ قانون اسلامی کی نئی تعبیر اور اصول فقہ نئی تشکیل کی ضرورت کا احساس بہت سے حضرات کو ہوا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے اس پر غور وفکر ہو رہا ہے۔ ہمارے برصغیر میں علامہ اقبال کو اس ضرورت کا سب سے زیادہ احساس تھا۔ برصغیر کے بہت مشہور محدث علامہ سید انور شاہ کشمیری نے بھی اس کا احساس کیا۔ اور بھی بہت سے دوسرے اہل علم وقتاً فوقتاً اس کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ جب تک یہ کام نہیں ہوگا ملت مسلمہ کے تہذیبی مستقبل کا خواب شرمندہ تعبیر رہے گا۔

اسلامی قانون یا فقہ کی تشکیل یا تدوین نو کے لیے تعلیم کی تشکیل نو درکار ہے۔ تعلیم کی تشکیل نو کن خطوط پر کی جائے؟ کن بنیادوں پر کی جائے؟ یہ موضوع ایک طویل گفتگو کا متقاضی مضمون ہے۔ اس پر ایک الگ سلسلہ محاضرات درکار ہے۔ اگر اللہ نے توفیق دی تو انشاء اللہ علم اور تعلیم کے موضوع پر ایک الگ سلسلہ محاضرات کو پیش کرنے اور مرتب کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اسلامی معاشرے میں علماء کرام کا کردار کیا ہے؟ علماء سے مراد محض دینی علوم کے علماء نہیں ہیں، بلکہ علم ومعرفت کی تمام شاخوں کے ماہرین مراد ہیں، اسلامی معاشرہ میں ان کا ایک اہم کردار ہے۔ اسلامی معاشرہ علم کا معاشرہ ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، جو معاشرہ علم کا معاشرہ ہوگا اس میں صاحب علم اور غیر صاحب علم برابر نہیں ہوسکتے۔ **ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون** خود قرآن نے کہا ہے کہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ لہذا اسلامی معاشرہ جب بھی وجود میں آئے گا اسلامی تہذیب کی جب بھی نقشہ کشی ہوگی اس میں اہل علم کو خاص احترام اور بلندی کا مقام حاصل ہوگا۔

سب سے آخری میدان میں بین الاقوامی تعلقات کے باب میں ہے۔ مستقبل میں سب سے اہم مضمون پوری اسلامی فقہ اور اسلامی شریعت میں بین الاقوامی تعلقات کا ہے۔ یہی وہ میدان ہے جہاں بقول علامہ اقبال مذہب اسلام آج گویا زمانے کی کسوٹی پر سب سے زیادہ کسا جا رہا ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کے اسلامی قوانین، غیر مسلموں سے تعلقات کے ضوابط، جہاد کے احکام، دنیا کی تقسیم، دار الاسلام، دار الکفر وغیرہ۔ یہ سب وہ معاملات ہیں جن کا تعلق اسلام کے فقہ سیر یعنی بین الاقوامی تعلقات کے قوانین اور احکام سے ہے۔ یہ انتہائی

اہمیت کے حامل موضوعات ہیں جن کے لیے تدوین نو کا عمل ناگزیر ہے۔

یوں تو اسلامی شریعت کا مستقبل، فقہ اسلامی کی تدوین نو پر بالخصوص اور پوری اسلامی شریعت کی تدوین نو پر بالعموم مبنی ہے۔ لیکن یہ تقابلی مطالعہ جو تدوین نو کے لیے ناگزیر ہے۔ سب سے زیادہ اسلام کے بین الاقوامی قانون، اسلام کے دستوری اور انتظامی احکام، اسلام کے فوجداری قوانین اور اسلام کے تجارتی اور مالی احکام کے ابواب میں ضروری ہے۔

آج ہم ایک نئی فقہ کی تشکیل کے عمل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ فقہ وہ ہے جس کو میں کئی بار اپنی گفتگوؤں میں globalized fiqh یا cosmopoliton fiqh کے نام سے یاد کر چکا ہوں۔ الفقہ العولمی بھی اس کو کہا جاسکتا ہے۔ آج کا دور بین الاقوامیت کا دور ہے، اسلام کی بین الاقوامیت کا صحیح اور مکمل مظاہرہ آج کے دور میں ہوگا۔ ماضی کا دور مختلف علاقوں اور مختلف ثقافتوں کے درمیان باہمی اتفاق کا دور تھا۔ جب اسلامی ریاست ایک بڑی ریاست تھی، بنی عباس کے دور میں یا سلطنت عثمانیہ کے زمانے میں، تو وہاں بھی اصل نوعیت یہ تھی کہ یہ مختلف خودمختار مسلم مملکتوں یا ریاستوں کا ایک ڈھیلا ڈھالا نیم وفاق تھا۔ عملاً یہی صورتحال تھی۔ آج کی زبان میں اس کو یہی کہا جاسکتا ہے۔ اس لیے اس صورتحال کے تقاضے کچھ اور تھے۔ آج جس نئے نظام کی طرف ہم بڑھ رہے ہیں وہ اس سے ذرا مختلف ہے۔ مستقبل میں کسی مسلکی فقہ کے بجائے ایک نئی فقہ عولمی کی ضرورت ناگزیر محسوس ہوتی ہے۔ مغربی عالمگریت کا مقابلہ اسلامی عالمگریت کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ جدید عالمگیریت کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اسلامی عالمگیریت کے بغیر چارہ نہیں ہے۔

اسلامی عالمگیریت کے لیے ناگزیر ہے کہ ایک عالمگیر فقہ کی تدوین نو کی جائے۔ اس کے لیے فقہ سیر کی تشکیل جدید سب سے پہلا قدم ہے۔ تجارتی اور مالیاتی فقہ کی تدوین نو جس پر خاصا کام ہو رہا ہے۔ اس میدان میں ناگزیر ہے۔ ان سارے میدانوں میں تشکیل نو اور بالخصوص فقہ کی تدوین نو کے لیے ہمیں قدیم اسلامی روایت سے انتہائی گہری اور مضبوط وابستگی کے ساتھ ساتھ مشرق و مغرب کے تمام مفید تجربات سے فائدہ اٹھانا پڑے گا۔

مغرب اور مشرق دونوں کے تجربات کیا ہیں؟ کیا رہے ہیں؟ علوم کے میدان میں بھی، صنائع اور فنون کے میدان میں بھی، ان سب سے گہری اور ناقدانہ واقفیت دنیائے اسلام کے

مستقبل کے لیے ناگزیر ہے۔ مغربی تہذیب بہت جامع اور بھرپور تہذیب ہے۔ مغربی تصورات میں کچھ پہلو مفید ہیں، کچھ پہلو ہمارے لیے غیر ضروری ہیں، کچھ پہلو اسلامی شریعت اور عقیدے کی روشنی میں ناقابل قبول ہیں، کچھ پہلو شدید گمراہیوں پر مبنی ہیں۔ یہ گمراہیاں جنہوں نے دنیائے اسلام میں بہت سے ذہنوں کو متاثر کیا ہے وہ کیا ہیں۔ یہ گمراہیاں بے شمار ہیں، یہ فکروفلسفہ کے میدان میں بھی ہیں۔ تعلیم اور مذہبیات کے میدان میں بھی ہیں۔ مذہبیات کے میدان میں بالخصوص کتب مقدسہ کی نوعیت کیا ہے؟ کتب مقدسہ یا نصوص مقدسہ کی تعبیر و تفسیر کے بارے مین بہت سی گمراہیاں پیدا ہوئی ہیں جن سے دنیائے اسلام میں بھی بعض لوگ متاثر ہو رہے ہیں۔ یہ گمراہیاں قانون اور سیاست کے میدان میں بھی ہیں۔ معاشیات کے باب میں بھی ہیں، نفسیات اور اخلاقیات سے بھی ان کا تعلق ہے۔ معاشرت و معیشت میں بھی بہت سی غلطیاں ہیں۔

جب تک ان تمام امور کا الگ الگ جائزہ نہیں لیا جائے گا اور ان گمراہیوں اور غلط تصورات پر عقلی تنقید کر کے ان کا برسر غلط ہونا ثابت نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک فکر اسلامی کی تشکیل نو اور فقہ اسلامی کی تدوین نو کا عمل دور جدید کے تقاضوں کی روشنی میں مشکل کام ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ دنیائے اسلام میں بہت سے مفکرین نے مغربی افکار کا اس نقطہ نظر سے تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔ خود علامہ اقبال اس کام میں پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علامہ اقبال کے بعد بھی برصغیر کے متعدد اہل علم نے یہ کام کیا ہے جن میں ڈاکٹر رفیع الدین اور مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نام بہت نمایاں ہیں۔ معاشی فکر و فلسفہ کے باب میں پاکستان کے دو نامور فرزندوں شیخ محمود احمد اور ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا کا کام تاریخ ساز اور رجحان ساز نوعیت کا ہے۔ برصغیر سے باہر بھی خود دنیائے مغرب میں بے شمار ایسے اہل فکر ہیں جن میں بعض کے نام میں نے لیے تھے۔ جنہوں نے اس موضوع پر کام کیا ہے اور مغربی تصورات کی کمزوریاں واضح کی ہیں۔

تہذیب اسلامی کی تشکیل اور عالم اسلام کے مستقبل کی تعمیر کے لیے یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ قدیم و جدید کے درمیان صحت مندانہ توازن اور غیر جانبدرانہ رواداری انتہائی ناگزیر اور ضروری ہے۔ یہ بات میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اسلامی روایت نے ہمیشہ ایک

توازن سے کام لیا ہے۔ اور دوسرے علوم وفنون اور دوسری تہذیبوں سے آنے والے عناصر کو اسلامی تہذیب میں بعض خاص شرائط وضوابط کی بنیاد پر داخلے کی اجازت ہے۔

آج اگر مغرب کا عمومی مزاج ظاہر اور خارج پر زور دینے کا ہے اور مشرق کا عمومی مزاج داخل اور باطن پر زور دینا رہا ہے تو آج ان دونوں کو یکجا کر دینے کی ضرورت ہے۔ جہاں داخل اور باطن کی اہمیت بنیادی اور اساسی ہے وہاں آج ظاہر اور خارج کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ ادبیات، فلسفہ، علوم وفنون وغیرہ میں ہمیشہ یہ فرق موجود رہا ہے، لیکن آج اس فرق پر از سر نو غور کر کے نئے انداز سے توازن قائم کرنا ناگزیر ہے۔ اسلام نے یہ توازن ہمیشہ قائم رکھا۔ لیکن مشرقی داخلیت جس کا نمونہ ایران اور ایران سے متاثرہ باطنی تہذیب میں زیادہ نمایاں تھا، جب باطنیت کا عمل دخل دنیائے اسلام کے بعض علاقوں میں بڑھا تو یہ توازن خاصا مختل ہوا اور اس توازن کو باطنیت کے تصورات نے بھی فروغ دیا، اسماعیلی اہل فکر اور اہل ادب نے بھی اس داخلیت اور باطنیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔ آج ان دونوں کو ایک تنقیدی مطالعہ کا مضمون بنا کر از سر نو توازن پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ہر دور میں بعض اہم فکری مسائل اور تہذیبی معاملات ایسے ہوتے ہیں جو کسی وجہ سے زیادہ اہمیت اختیار کر لیتے ہیں اور پھر ساری فکری اور تہذیبی سرگرمی انہی کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر بیسویں صدی کے نصف اول میں جو فکر تھی، اسلامی بھی اور اسلام کے دائرے سے باہر بھی، وہ ریاست وسیاست پر مرتکز تھی۔ اس زمانہ کے تمام بڑے بڑے مفکرین اسلام اسلامی ریاست اور اسلامی سیاست پر لکھ رہے تھے۔ اس لیے کہ اس دور میں یہی بڑا مسئلہ تھا، ریاست کی حقیقت اور ماہیت پر غور وخوض، اسلامی ریاست کی تشکیل، یہ مسائل فکر اسلامی کے نمایاں مسائل تھے۔

بیسویں صدی کے نصف دوم میں ریاست اور سیاست کی مرکزیت کم ہوگئی اور اقتصاد و مالیات کی مرکزیت نمایاں ہوگئی۔ چنانچہ فکر اسلامی کا اہم مضمون سیاست اور ریاست کے بجائے اقتصاد و مالیات کے مضامین قرار پائے۔ آئندہ پچیس سال یا کم وبیش ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیریت اور اس کے مسائل، گلوبلائزیشن کے مسائل، فکر کے بنیادی مسائل ہونگے اور دنیا کے مفکرین اور اہل علم کی توجہ ان معاملات کی طرف رہے گی۔ اس لیے ہماری ذمہ داری

خاص طور پر آئندہ چند عشروں میں یہ ہے کہ عالمگیریت کی فکری اور اخلاقی اساس کا تعین کرنے میں دنیا کی رہنمائی کریں۔ اخلاق کی عالمگیر اور متفقہ اساس کی نشاندہی کریں اور مذہب اور معاشرہ، مذہب اور تہذیب، مذہب اور ریاست، مذہب اور معیشت کے اس تعلق کو دوبارہ یاد دلائیں جو دنیا نے بھلا دیا ہے۔ اس تعلق کو مغرب نے بھلایا تو اس کے کچھ اسباب بھی تھے۔

مغرب کی نظر میں اصل مسئلہ ان کی عسکری اور اقتصادی قوت کے تحفظ کا تھا۔ اس عسکری اور اقتصادی قوت کا تحفظ کرنے اور اسے فروغ دینے کے عزائم اور عمل میں جب شدت پیدا ہوئی تو اہل مغرب نے محسوس کیا کہ اخلاق اور مذہب کے قواعد ان عزائم کے راستہ میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔ اس پر انہوں نے ان تمام علائق اور رکاوٹوں کو دور کر دیا اور یوں اخلاق اور مذہب کا تعلق سیاسی اور اقتصادی زندگی سے کٹ گیا۔ وہ آج بھی یہ چاہتے ہیں کہ اپنی عسکری اور اقتصادی قوت کو محفوظ بنائیں، اس کے تسلسل کو یقینی بنائیں اور مشرق کو اپنا عسکری اور اقتصادی حریف بننے سے روکیں۔

آج وہ دنیائے اسلام کو نہ اقتصاد کے میدان میں اپنا حریف بننے دینے کے لیے تیار ہیں اور نہ عسکری میدان میں۔ ان کی کوشش یہ ہے کہ اہل مشرق کو مغرب کی پیروی پر آمادہ رکھا جائے اور ایسا ذہن بنایا جائے کہ اہل مشرق اپنے نظام اور تہذیب کے مستقبل سے مایوس ہو جائیں۔ آج اگر ہمارا نوجوان اپنے مستقبل سے، اپنے ملک کے مستقبل سے، تہذیب کے مستقبل سے مایوس نظر آتا ہے، یا بے یقینی کا شکار نظر آتا ہے تو اس کے اسباب گزشتہ ڈھائی تین سو سال کی مغرب کی تاریخ میں تلاش کرنے چاہئیں۔

ہمارے یہاں جو حضرات مغرب کی تقلید کو موثر نسخہ سمجھتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ مقلد ہمیشہ مقلد رہتا ہے۔ مقلد کبھی بھی مجتہد کی برابری نہیں کر سکتا، یہ اجتہاد فقہ اور شریعت کے باب میں ہو یا سائنس اور ٹکنالوجی کے باب میں۔ جو سائنس اور ٹیکنالوجی میں مقلد بنے گا وہ مقلد رہے گا اور مجتہد کی پیروی کرنے پر مجبور ہوگا۔ جو معاشیات سیاسیات اور قانون میں مقلد بنے گا وہ ان میدانوں کے مجتہد کی تقلید ہی کرے گا، وہ کبھی بھی آزاد اور خود مختار ذہن کے ساتھ قانون، سیاست اور معیشت کے باب میں نئے تصورات کو فروغ نہیں دے سکتا۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ اور سب سے بڑی فکری الجھن یہی رہی ہے۔

بظاہر اسلامی تہذیب مشرقی ہے لیکن بباطن آفاقی ہے۔ یہ مادی اور روحانی دونوں خصائص کی جامع ہے۔ یہ جلال و جمال دونوں کی یکساں مظہر ہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں یہ جنیدی بھی ہے اور اردشیری بھی، دونوں کا نمونہ بیک وقت اس میں پایا جاتا ہے۔ اس میں جلال بھی ہے اور جمال بھی ہے۔

اگر ان تمام تصورات کی بنیاد پر جن میں سے بعض کا ذکر اس سلسلہ محاضرات میں کیا گیا ہے۔ امت مسلمہ ایک واضح نصب العین وضع کرے اور اس نصب العین کی بنیاد پر پوری امت مسلمہ کو متحرک کیا جائے تو امت مسلمہ کو اس انحطاط اور زوال سے بچایا جا سکتا ہے۔ اصل، بنیادی اور سب سے اولین مسئلہ نصب العین کے تعین کا ہے۔ نصب العین یا ہدف الاھداف کا تعین امت مسلمہ کا اولین فریضہ ہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں غایۃ الغایات مسلمانوں کی کیا ہے؟ اس دنیا کے امور کے بارے میں اس غایۃ الغایات کے تعین کے لیے اور مستقبل میں تبدیلی کے لیے ضروری ہے کہ ہدایت ربانی کو سمجھا جائے، اس کی اساسات، اس کے نصوص، مقاصد اور کلیات وقواعد کی اچھی اور بنیادی فہم حاصل کی جائے۔ پھر مجتہدات یعنی وہ مسائل جو اجتہادی نوعیت کے ہوں اور وہ متغیرات، وہ عادات، وہ طریقے اور وہ تقاضے جو بدلتے رہتے ہیں ان کا ادراک کیا جائے۔ اور ان سب کے درمیان فرق کیا جائے۔ مقاصد اور وسائل کے درمیان امتیاز کیا جائے، جس معاشرے میں تبدیلی لانا مقصود ہے اس کو جیسا کہ وہ ہے اسی طرح سمجھا جائے، معاشرے کو جیسا ہونا چاہیے کی بنیاد پر سمجھنا اور اس سمجھ کی بنیاد پر اقدام کرنا ایک بڑی غلطی ہے۔ ماضی میں بھی یہ مہلک غلطیاں بہت سے افراد سے ہوئی ہیں۔ اگر معاشرے میں کوئی کمزوری پائی جاتی ہے تو اس کمزوری کا احساس اور ادراک کر کے معاملات کا حل پیش کرنا چاہیے۔ یہ تصور بھی فقہائے اسلام ہی نے دیا ہے اور اس کو عموم بلوی کا نام دیا ہے۔

اس ہمہ گیر تبدیلی کے لیے جس کے لیے بعض پرجوش سیاسی کارکن انقلاب کا لفظ استعمال کرتے ہیں تمام جائز، مؤثر اور رائج الوقت وسائل سے استفادہ کیا جانا چاہیے کہ یہی سنت رسولؐ ہے۔ وسائل کے استعمال میں اور وسائل کو اختیار کرنے میں اصل محرک اور اساس مشاہدے اور تجربہ پر ہو، آزادانہ عقلی بصیرت اور اجتہاد ہو، محض مشرق و مغرب کی تقلید نہ ہو۔

یہ وہ امور ہیں جو آج مستقبل کی نقشہ کشی اور نصب العین کی تحدید کے لیے ناگزیر ہیں۔

اس پورے عمل میں بنیادی کردار اجتہاد اور اجماع کے اداروں کا ہے۔ اجتہاد کے بارے میں یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اس کا ختم نبوت سے نہایت گہرا اور قریبی تعلق ہے۔ لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ عالم اسلام کا تہذیبی مستقبل اور ختم نبوت یہ دونوں ایک دوسرے پر دارومدار رکھتے ہیں۔ ختم نبوت ایک dynamic عقیدہ ہے جو انسانی ذہن کی آزادی کے ساتھ ساتھ نظم و ضبط اور اس کی سمت درست رکھنے کی ضمانت دیتا ہے۔ انسانی ذہن نظم وضبط کا پابند ہو اور اس کو نئی جہتیں اور نئی direction حاصل ہو۔ یہ کام عقیدہ ختم نبوت انجام دیتا ہے۔ لہٰذا ختم نبوت پر ایمان دنیائے اسلام کے مستقبل اور وحدت کے لیے ناگزیر ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبہ اجتہاد میں کہا تھا کہ آج انسانیت کو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ کائنات کی روحانی تعبیر، جو قرآن کریم اور سنت کی رہنمائی میں کی جائے گی۔ فرد کی روحانی آزادی اور عالمگیر نوعیت کے ایک ایسے بنیادی اصول سے وابستگی جو انسانی معاشرے کو مسلسل پیش رفت کی بنیاد پر رہنمائی فراہم کر سکے۔

آج کی ان فکری مشکلات کو دور کرنے میں اور تہذیبی مستقبل کی ضروریات سے عہدہ برآ ہونے میں امت مسلمہ کا سب سے بڑا مسئلہ ایسی فکری قیادت کی کمی بلکہ فقدان ہے جو ان تمام تقاضوں کا ادراک رکھتی ہو۔ ان تقاضوں کے ادراک کے ساتھ ساتھ مستقبل کی منزل مقصود کا واضح تصور رکھتی ہو اور راستے میں آنے والی مشکلات کا گہرا شعور بھی رکھتی ہو۔ دور جدید میں نفاذ اسلام کے لیے افراد کار اس وقت تک دستیاب نہیں ہوں گے جب تک ایسی مطلوبہ قیادت وجود میں نہیں آئے گی۔ جب تک یہ مطلوبہ قیادت وجود میں نہیں آئے گی اس وقت تک مغرب کے ساتھ مکالمہ اور آزادانہ اور باعزت سطح پر گفت وشنید کا وہ عمل انجام نہیں پاسکتا جو تہذیبی اخذ وعطا کے لیے ناگزیر ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی فکری قیادت ہے جو مغربی تہذیب کے بارہ میں مناسب اسلامی رویے اور نقطہ نظر کا تعین اور تشکیل کرے گی۔ یہی قیادت ایک نئے پیراڈائم کی تصویرکشی کرے گی، نئے مثالیے کی تعمیر اور تشکیل کا فریضہ انجام دے گی۔ وہ مثالیہ جس میں خاندان کا ادارہ پوری طرح محفوظ ہو۔ جس میں خواتین کا کردار فعال اور تعمیری ہو، جس میں عقل ونقل میں مکمل توازن پایا جاتا ہو۔ جس میں معاشرے کی تشکیل اخلاقی اور روحانی اقدار کی بنیاد پر کی گئی ہو۔

یہ ذمہ داریاں جب انجام دی جائیں گی تو داخلی اور خارجی دونوں سطح پر انجام دی جائیں گی۔ امت مسلمہ کے بین الاقوامی کردار کے جہاں اقتصادی سیاسی اور قانونی پہلو ہیں وہاں اخلاقی، مذہبی اور انسانی پہلو بھی ہیں۔ آج بین الاقوامی معاملات میں اخلاق اور مذہب کا حوالہ اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا گزشتہ تین چار سو سال سے جس بین الاقوامی لین دین اور بین الاقوامی قانون سے مانوس ہے وہ بڑی حد تک اخلاق اور مذہب سے لاتعلق ہے۔ اس تعلق کو دوبارہ استوار کرنا اور بین الاقوامی تعلقات کو اخلاق اور کردار کی بنیاد پر تعمیر کرنا پوری انسانیت کی بنیادی ضرورت ہے۔ اور اس ضرورت کی تکمیل کا سامان اسلامی شریعت اور اسلامی تہذیب ہی کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔

آج مادیات اور روحانیات کے مابین وہ علمی اور فکری بعد باقی نہیں رہا جو گزشتہ ہزار ہا سال سے موجود تھا۔ آج فلسفہ اور سائنس ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں۔ مادہ اور روح matter اور spirit کے درمیان جو فرق اور امتیاز ماضی میں کیا جاتا تھا وہ ختم ہو رہا ہے۔ آج سائنس کے برتر اصولوں کو سمجھے بغیر سائنس کی مزید ترقی کے راستے بند نظر آتے ہیں۔ یہ برتر اصول فلسفہ اور حکمت کی سرحد پر نہیں۔ بلکہ ان کی حدود کے خاصا اندر واقع ہیں۔ ایک سطح پر فلسفہ اور مذہب کے میدان میں حکماء اور علماء دونوں کا اجتماع ہو جاتا ہے۔ گویا فلسفہ اور مذہب میں قدیم علماء اور منطقیوں کے قول کے مطابق عموم خصوص من وجہ کی نسبت قائم ہو جاتی ہے۔ اب سائنس بھی ان حدود میں داخل ہو رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دور پھر آنے والا ہے جب فقیہ اور مفسر حکیم بھی تھا اور سائنس دان بھی تھا۔

اسلام کے تہذیبی اور تمدنی ہدف کے تعین اور تشکیل میں جن مسلمان اہل علم کے افکار سے خصوصی استفادہ کیا جانا بہت ضروری ہے ان میں ائمہ مجتہدین کے ساتھ ساتھ ابن خلدون، ابن رشد، علامہ عزالدین السلمی، امام شاطبی اور ہمارے برصغیر کے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حکیم الامت علامہ اقبال شامل ہیں۔ اسلامی شریعت کی جامعیت، ہمہ گیریت اور عالمگیریت پر زور دینا ہی دراصل اس پورے سلسلہ محاضرات کا مقصود تھا۔ شریعت کے بارے میں بہت سے لوگ یہ سمجھتے رہے ہیں کہ وہ چند قوانین نکاح وطلاق کا مجموعہ ہے۔ یہ پورا گلستان تہذیب جس کی ایک جھلک ان محاضرات میں آپ کے سامنے آئی۔ شریعت کے بہت سے ناقدین اور

مبصرین کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ وہ اس پورے گلستان میں اپنی مرضی کا ایک پھول یا اپنی مرضی کا کوئی پتا حاصل کرنا چاہتے تھے، اور اسی سے کام چلا رہے تھے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ وہ پھول یا وہ پتا یا جزوی شاخ جو کسی کو حاصل ہوئی ہے اس سے دوبارہ اس گلستان کو زندہ کیا جاتا اور اسی طرح کیا جاتا جس طرح صدر اسلام کے اہل علم، اہل دین اور اصحاب فکر و دانش اور امت کے دیگر فکری اور تہذیبی قائدین نے کیا تھا۔ میں ایران اور مغل ہندوستان کے فلسفی شاعر مولانا عرفی شیرازی کے ایک شعر پر اس سلسلہ محاضرات کا اختتام کرتا ہوں۔

من از گل باغ می جویم تو گل از باغ می جوی
من آتش از دخان بینم تو از آتش دخان بینی

و اخر دعونا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

☆

بارہ خطبات پر مشتمل اضافہ جات کے ساتھ

ڈاکٹر محمود احمد غازی